یکم و ۱۶ دسمبر ۲۰۲۴ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۷ ۔ شمارہ نمبر: ۲۳۔۲۴

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، محمد عمید فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰ (۹۲۔۲۱)
برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔
۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔
۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔
۴ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔
۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

شام: بَشار کی مَعزولی، نئے امکانات

Stephan Richter

(سیاسی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ اِن تبدیلیوں کے نتیجے میں دنیا تبدیل ہوتی ہے، معیشتیں متاثر ہوتی ہیں اور معاشرتی سطح پر بھی اکھاڑ پچھاڑ ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ ناگزیر ہے کیونکہ دنیا بھر میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ کسی نہ کسی نتیجے کے حصول کے لیے ہے اور جب نتائج سامنے آتے ہیں تو تبدیلیاں بھی لامحالہ رونما ہوتی ہیں۔
دنیا بھر میں طرح طرح کی حکومتیں اور حکومتی نظام پائے جاتے ہیں۔ ایک طرف جمہوریت ہے اور دوسری طرف مکمل آمریت۔ کہیں انتہائی جبر کے ساتھ حکومت چلائی جارہی ہے اور کہیں جمہوری اداروں کے ماتحت حکمرانی کے ڈول ڈالے جارہے ہیں۔ یہ سب کچھ ساتھ ساتھ چل رہا ہے اور ایک دوسرے پر اثرانداز بھی ہو رہا ہے۔
کسی بھی ملک میں جب جبر حد سے گزر جاتا ہے تو لوگ حقیقی تبدیلیوں کو یقینی بنانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ مسلح گروپ اپنا (اچھا یا بُرا) کردار ادا کرتے ہیں۔ کل بھی ایسا ہی ہوتا تھا اور آج بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔)

دنیا بھر میں حکومتوں کا دھڑن تختہ ہوتا رہتا ہے۔ جب کوئی حکومت ختم ہوتی ہے تو لامحالہ متعلقہ ملک میں بڑے پیمانے پر تبدیلیوں کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ آیئے اس بات کا جائزہ لیں کہ دو حکمران اقتدار سے محروم ہونے کے بعد کس طور، دانستہ یا نادانستہ طور پر، دنیا کو تبدیل کر رہے ہیں۔

دنیا کے کئی گوشوں میں اسرائیل کے وزیر اعظم بنیامین نیتن یاہو کو انتہائی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ آج کی زندگی کی یہ ایک تلخ حقیقت ہے۔ انٹرنیشنل کرمنل کورٹ نے بنیامین نیتن یاہو کی گرفتاری کا وارنٹ بھی جاری کر رکھا ہے۔

کسی بڑی تبدیلی کی آمد

نیتن یاہو ایک خوش قسمت انسان بھی تو ہے۔ ایک زمانے تک اِس شخص نے جو کچھ بھی محض خواب و خیال میں دیکھا ہے، سوچا ہے وہ اب حقیقت کا روپ دھارتا دکھائی دے رہا ہے۔

اس حقیقت سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے کہ نیتن یاہو نے غزہ اور لبنان کے باشندوں پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے ہیں۔ ان دونوں خطوں کے لیے اسرائیلی فوج کا کردار انتہائی گھناؤنا رہا ہے۔ جو کچھ نیتن یاہو کے ذہن میں تھا، وہ اب حقیقت کا روپ دھارنے کو ہے یا بہت حد تک روپ دھار بھی چکا ہے۔ جو کچھ اسرائیلی قیادت اور فوج نے غزہ اور لبنان میں کیا ہے، اُس کے خلاف عرب ممالک اور باقی دنیا تو احتجاج کیا ہی جا رہا ہے، خود اسرائیل میں بھی احتجاج کرنے والے کم نہیں۔ اس کے باوجود ذرا اِس حقیقت پر بھی غور کیجیے کہ اسرائیلی اقدامات کے حوالے سے بیشتر مسلم ممالک اور (بالخصوص سُنّی ممالک) کے حکمرانوں کا احتجاج برائے نام رہا ہے۔

ایران اور اُس کے ہم خیال بڑے ممالک نے مشرقِ وسطیٰ میں ایک طویل مدت تک جو کھیل کھیلا ہے، وہ اِس خطے کے ممالک کے لیے سوہانِ روح رہا ہے۔ بیشتر عرب ممالک کو یہ اُمید ہے کہ اسرائیل اپنی بھرپور عسکری قوت اور بھرپور عزم کے ساتھ تکنیکی قطعیت، منصوبہ سازی اور ذہانت کو بروئے کار لاتے ہوئے خطے سے ایران کے اثرات کو ختم کر کے دم لے گا۔ اِن ممالک کو اندازہ ہے کہ ایران نے ایک طویل مدت تک مشرقِ وسطیٰ میں عسکریت پسندی اور دہشت گردی کو ہوا دی ہے۔

ایردوان، ایک بڑے کھلاڑی

مشرقِ وسطیٰ کی شکل پوری طرح بدلی نہیں تاہم ترک صدر رجب طیب ایردوان کی بھرپور معاونت سے شام میں بشار انتظامیہ کا دھڑن تختہ ہو چکا ہے اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والی تبدیلیاں مشرقِ وسطیٰ کو تبدیل کیے بغیر نہیں رہیں گی۔

جو کچھ ہو رہا ہے، اُس کے نتیجے میں کسی بھی شخص کو مشرقِ وسطیٰ میں بہت بڑے پیمانے پر مختلف النوع تبدیلیوں کی امید رکھنی ہی چاہیے۔ بشار الاسد کی حکومت دو عشروں سے بھی زائد مدت سے قائم تھی۔ اس دوران وہ اپنے اقتدار کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کی کوششوں میں مصروف رہے۔ شام میں رونما ہونے والی تبدیلیاں خطے کے دوسرے بہت سے ممالک میں بھی رونما ہو سکتی ہیں۔

دنیا بھر میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ شام انتہائی پسماندہ اور گیا گزرا ملک ہے۔ بہت سوں کی نظر میں شام ایک ناکام ریاست بھی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ شامی معاشرے کا بڑا حصہ روایتی طور

اندرونی صفحات پر

- سالِ نو: دنیا کو لاحق خدشات
- ٹرمپ کی جیت میں 'ڈپلومہ تقسیم' کا کردار
- مشرقِ وسطیٰ میں ''قضیۂ کُرد''
- شام میں امریکی مداخلت ناگزیر
- جرمنی معاشی بحران کی زد میں
- بنگلادیش: طلبہ انقلاب اور شیخ حسینہ کے ظالمانہ اقتدار کا خاتمہ
- ۲۰۲۵ء: پاکستان کے لیے اُمیدیں اور چیلنج

پر مہذب اور قانون پسند ہے۔ شامی باشندوں کی اکثریت سیکولر ہے اور جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ رہنے کو ترجیح دیتی ہے۔ شام میں اعلیٰ سطح کے ہنرمند افراد کی بھی کمی نہیں۔

شام میں موجود افراد اور بیرونِ ملک مقیم شامی باشندے کبھی نہیں چاہیں گے کہ اُن کے ملک کو ناکام ریاست کا درجہ ملے۔ اُن کی طرف سے ملک کی سلامتی، سالمیت اور ترقی کے لیے غیر معمولی کردار متوقع ہے۔ وہ یقینی طور پر اپنے وطن کی خاطر کچھ بھی کر گزریں گے اور دنیا کو بتائیں گے کہ وہ اپنے وطن کے لیے واقعی فکرمند ہیں۔ محض شامی باشندوں کا نہیں بلکہ پوری عرب دنیا کا مفاد اس بات میں ہے کہ شام میں خرابی نہ رہے یا زیادہ دیر نہ رہے۔ شام کی سلامتی اور سالمیت کے لیے اُس کے باشندوں کے ساتھ ساتھ باقی عرب دنیا بھی کچھ نہ کچھ کرنا چاہے گی۔

شام میں روس کا گھٹا ہوا کردار

بشار انتظامیہ کا دھڑن تختہ ہونے سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ روس کی طاقت وہ نہیں جو سمجھی جاتی رہی ہے۔ لاکھ کوشش کے باوجود روس کے صدر ولادیمیر پوٹن شامی حکومت کو برقرار رکھنے میں ناکام رہے۔ روس کو ایسے عفریت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جس کے پاؤں مٹی کے ہیں۔ اگر سب کچھ یونہی چلتا رہا تو روس کو مشرقِ وسطیٰ اور بحیرۂ روم میں اپنی عسکری موجودگی سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔

مشرقِ وسطیٰ میں روس کے کردار کو مزید کمزور کرنے والے اقدامات سعودی عرب کی طرف سے ہوسکتے ہیں۔ اگر سعودی عرب نے اپنی تکنیکی استعداد کے مطابق زیادہ تیل نکال کر مارکیٹ میں ڈمپ کرنا شروع کردیا تو روس کی تیل کی برآمدات کا گراف تیزی سے نیچے آئے گا اور یوں اُس کے لیے عالمی منڈی میں قدم جمائے رکھنا انتہائی دشوار ہوجائے گا۔ اگر سعودی عرب نے عالمی منڈی میں خام تیل کی قیمت نیچے لانے کا فیصلہ کرلیا تو روس کے پاس پسپائی کے سوا کوئی راستہ نہیں بچے گا۔ روسی معیشت کا مدار بہت حد تک خام تیل کی برآمد پر ہے۔ وہ گیس بھی برآمد کرتا ہے۔ یوکرین جنگ کے نتیجے میں روس کی تیل اور گیس کی برآمدات شدید بحرانی کیفیت سے دوچار رہی ہیں۔ ایسے میں روس اس قابل نہیں رہ گیا کہ مشرقِ وسطیٰ میں کوئی بڑا کردار کُھل کر ادا کرسکے۔

ٹرمپ فیکٹر

ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ اس پوری صورتحال میں ڈونلڈ ٹرمپ کا کردار کیا ہوسکتا ہے؟ اس حوالے سے ذہن کے پردے پر بہت سے نکات ابھرتے ہیں۔ ٹرمپ کو پسند نہ کرنے والے بھی کم نہیں تاہم اُنہیں یورپ اور دیگر خطوں میں انتہا ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھنے والے خاصے کم ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ شام میں رونما ہونے والی تبدیلیاں ڈونلڈ ٹرمپ کو زیادہ پریشان کریں گی۔

ٹرمپ یقینی طور پر یہ چاہیں گے کہ یورپ والے اُن کے بارے میں ایسا ویسا سوچنا چھوڑ دیں۔ اہلِ یورپ ٹرمپ کو نیچا دکھانے کی کوششیں ترک کرنے سے گریزاں ہیں۔ اُن کے خلاف یورپ بھر میں ایک خاص قسم کا تاثر پایا جاتا ہے۔ یہ تاثر ختم کرنا ٹرمپ کی بنیادی ضرورت ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسا ہو تو کیسے ہو۔ سعودی عرب سے غیر معمولی قربت نے ٹرمپ کو یورپ کی نظر میں قدرے ناپسندیدہ بنادیا۔ ایسا نہیں ہے کہ امریکا اور سعودی عرب کے درمیان قربت نے یورپ کو بالکل ہی فیض نہ پہنچایا ہو۔ امریکا اور یورپ صدیوں حلیف رہے ہیں۔ ایسے میں یہ سوچنا سادہ لوحی ہے کہ امریکا اور سعودی عرب کے درمیان بڑی ڈیلز کا یورپ کو کچھ فائدہ نہ پہنچے۔

اگر سعودی عرب خام تیل کی عالمی منڈی پر اثر انداز ہو، قیمتیں نیچے لے آئے تو روس کے لیے وسائل کی کمی کا مسئلہ پیدا ہوگا اور یوں وہ یوکرین میں جنگ جاری نہ رکھ پائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ ٹرمپ کی حمایت یافتہ یا ٹرمپ کی طرف سے تھوپی جانے والی کوئی بڑی ڈیل تیار ہوچکی ہو اور یوکرین سے جنگ ختم کرنے پر روس کو مجبور کر ہی دے۔ روس کے لیے یوکرین جنگ جاری رکھنا انتہائی دشوار ہوتا جارہا ہے کیونکہ اُس کا اپنا بھی خاصا جانی و مالی نقصان ہوچکا ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ کو بہت سوچ سمجھ کر کام کرنا ہوگا۔ وہ کوئی سفارت کار نہیں اور امن کے نمائندے بھی نہیں مگر پھر بھی اُن کی کوشش ہوگی کہ معاملات قابو میں رہیں اور یوکرین جنگ ختم ہو۔

ہم اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتے کہ ڈونلڈ ٹرمپ انتقام پسند مزاج کے حامل ہیں۔ وہ خاصے غیر متوقع طریقے سے حساب برابر کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ چین سے تجارتی جنگ اِس کی بہت واضح مثال ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ جب دوسری بار صدر کا منصب سنبھالیں گے تب اُن کے ذہن میں یہ بات ضرور رہی ہوگی کہ سابق صدر براک اوباما کو ۲۰۰۹ء میں امن کا نوبیل انعام دیا گیا تھا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اُنہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا جس کی بنیاد پر اُنہیں یہ اعزاز دیا جاتا۔

ہوسکتا ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ کی نظر امن کے نوبیل انعام پر بھی ہو۔ اور تو ایسا بہت ہی کم ہے جس کے پانے کے لیے وہ بے تاب ہو۔ اگر ڈونلڈ ٹرمپ امن کا نوبیل انعام پانے میں کامیاب ہوتے ہیں تو یہ دراصل جمہوری دنیا کے قائدین پر اپنی مہارت اور برتری کا ثبوت فراہم کرنے جیسا معاملہ ہوگا۔

ٹرمپ یہ بھی چاہیں گے کہ تاریخ کے ریکارڈ میں اُن کا ذکر کسی ایسی ویسی بات کے لیے نہ ہو بلکہ کسی مثبت اقدام کے نتیجے میں کیا جائے۔ اس کے لیے انہیں روس کو پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کرنا ہوگا۔ یہ کام آسان نہیں کیونکہ روسی صدر ولادیمیر پوٹن سے اُن کے تعلقات بہت اچھے رہے ہیں۔

ڈونلڈ ٹرمپ کو ہارنے والوں سے نفرت ہے۔ روس، ایران، شمالی کوریا اور چین کا اتحاد اپنی طاقت کھو رہا ہے۔ روس، ایران اور شمالی کوریا کی معیشتیں بحرانی کیفیت سے دوچار ہیں۔ چین کی معیشت مضبوط ضرور ہے مگر اِتنی مضبوط نہیں کہ باقی ساتھیوں کی بھرپور مدد کرسکے۔ مشرقِ وسطیٰ میں اِن ملکوں کا اتحاد جو کچھ کر رہا تھا، وہ اِن کی اپنی کوششوں سے زیادہ نیتن یاہو کے اقدامات کا نتیجہ تھا۔

ٹرمپ کو اور بہت سی باتوں کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔ اپنے پہلے عہدِ صدارت کی طرح اس بار بھی انہیں شمالی کوریا کے سربراہ کم جانگ اُن سے محتاط رہنا چاہیے۔ روس سے بھی امریکا کے تعلقات میں وہ گرم جوشی نہیں رہی۔ پہلے عہدِ صدارت میں ٹرمپ نے اپنی فیملی کو روس میں تعمیراتی ٹھیکے دلوائے تھے مگر اِس بار، اقتصادی پابندیوں کے باعث، ایسا ممکن نہیں۔

ایران میں کمزور پڑتی ہوئی قیادت

شام کی صورتحال کے بعد ایران کی قیادت بھی کمزور پڑتی دکھائی دے رہی ہے۔ ایسے میں ڈونلڈ ٹرمپ چاہیں گے کہ ایران میں غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہوں۔ وہ حجاب مخالف خواتین کی حمایت کریں گے اور چاہیں گے کہ ایران میں جمہوریت کا بول بالا ہو۔ اُن کی ایک بڑی خواہش یہ بھی ہوگی کہ کسی نہ کسی طور ایران میں قیادت کی تبدیلی واقع ہو۔ چین البتہ ٹرمپ کے لیے دردِ سر بنا رہے گا۔ اس معاملے میں وہ یورپ پر بھی دباؤ ڈال سکتے ہیں کہ وہ امریکا کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے چین سے معاشی تعلقات کی بساط یا تو لپیٹ دیں یا اِن تعلقات کو علامتی حیثیت میں زندہ رکھیں۔

دی نیوکلیئر فیکٹر

اگر روس کے صدر ولادیمیر پوٹن نے ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کی دھمکی دینا جاری رکھی تو ٹرمپ کے لیے معاملات بہتر رہیں گے کیونکہ ایسی صورت میں وہ روس پر عالمی اداروں

////// باقی صفحہ نمبر ۱۵ \\\\\\

۲۰۲۵ء میں دنیا کو درپیش خدشات

ملیحہ لودھی

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد سے دنیا آج جتنی عدم استحکام اور بے یقینی کا شکار ہے، شاید اس سے پہلے کبھی نہ رہی ہو۔ جغرافیائی سیاسی کشیدگی عروج پر ہے، یوکرین اور مشرقِ وسطیٰ جنگ کے شعلوں کی لپیٹ میں ہیں اور بڑھتے ہوئے ماحولیاتی خطرات نے آنے والے سال کو مزید پریشان کن بنا دیا ہے۔

گزشتہ چند سالوں سے عالمی آرڈر مسائل سے دوچار ہے۔ دوسری جانب کثیر قطبی دنیا کی جانب بڑھتے ہوئے جھکاؤ کی وجہ سے مغربی تسلط کم ہوتا جا رہا ہے جبکہ کثیر الجہتی ادارے شدید دباؤ میں ہیں۔ طاقت کے عالمی توازن میں تبدیلیوں کے منظر نامے میں جغرافیائی سیاست کی تشکیل میں درمیانی طاقتیں اہم کردار ادا کریں گی۔

۲۰۲۵ء کا سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا نومنتخب امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کا دوسرا دورِ حکومت، عالمی معاملات میں مزید عدم استحکام کا باعث بنے گا؟ ان کی اعلان کردہ پالیسیاں تشویش ناک ہیں، جو پہلے سے ہی مشکلات سے گھری دنیا کے حالات کو مزید بگاڑ دیں گی۔

جغرافیائی سیاسی سطح پر یہ دیکھنا اہم ہوگا کہ ٹرمپ کی حکمرانی میں امریکا اپنے اتحادیوں، مخالفین اور حریفوں سے کیسے ڈیل کرتا ہے۔ اگلے سال میں امریکا اور چین کے درمیان تعلقات کا مستقبل کیسا رہے گا، یہ بھی اسٹریٹجک اعتبار سے اہمیت کا حامل ہوگا۔ ڈونلڈ ٹرمپ کی غیر متوقع شخصیت کے پیش نظر چین اور امریکا کے حوالے سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیا پتا وہ دونوں ممالک میں کشیدگی میں مزید اضافہ کر دیں، یہ اب ان کے طرزِ عمل پر منحصر ہے کہ وہ معاملات کو کس طرح سنبھالتے ہیں۔

امریکا کے ساتھ تجارتی سرپلس والے چین سمیت دیگر ممالک پر زیادہ محصولات عائد کرنے کی ٹرمپ کی دھمکی سے بہت سے ماہرین اتفاق کرتے ہیں کہ ۲۰۲۵ء کے سب سے بڑے خطرات میں عالمی تجارتی جنگ بھی شامل ہوگی۔ لندن میں قائم رسک کنسلٹنسی فرم، کنٹرول رسکس نے پیش گوئی کی ہے کہ آئندہ سال 'قومی سلامتی کو بین الاقوامی تجارت اور سرمایہ کاری کے رہنما اصول کے طور پر قائم کرے گا'۔

ڈونلڈ ٹرمپ کی جانب سے تجارتی تحفظ پسندی میں واشنگٹن کس حد تک جائے گا، یہ چین امریکا تعلقات کے ساتھ ساتھ عالمی معیشت کے لیے بھی نتیجہ خیز ثابت ہوگا۔ تاہم بڑے تجارتی شراکت دار خاص طور پر چین پہلے ہی اس حوالے سے سرگرم ہیں کہ اپنی حکمت عملیوں کو ٹرمپ سے کیسے محفوظ بنایا جائے۔ دی اکانومسٹ نے اپنی سالانہ اشاعت 'دی ورلڈ آہیڈ ان ۲۰۲۵ء' میں نوٹ کیا ہے کہ چینی فرمز پہلے ہی تجارتی رکاوٹوں کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ گلوبل ساؤتھ میں نئی مارکیٹس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے بیرون ملک خود کو وسعت دے رہی ہیں۔ بلیک راک کے ایک جائزے نے امریکا اور چین کے درمیان ٹیکنالوجی کے بڑھتے ہوئے فرق کو ایک بڑھتے ہوئے عالمی خطرے کے طور پر دیکھا ہے۔

۲۰۲۵ء طے کرے گا کہ یوکرین اور مشرقِ وسطیٰ کی جنگوں کے نتائج کیا ہوں گے۔ یوکرین کے حوالے سے ڈونلڈ ٹرمپ کی جانب سے پالیسیز میں تبدیلی کے بیانات پہلے ہی یورپی حکومتوں کو بے چین کر رہے ہیں۔ وہ اکثر دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ یوکرین جنگ 'ایک دن میں' ختم کروا سکتے ہیں، توقع کی جا رہی ہے کہ ٹرمپ یوکرین کو روس کے ساتھ مذاکرات کی میز پر بیٹھنے کے لیے مجبور کریں گے۔ اگرچہ انہوں نے مسئلہ حل کرنے کے لیے کوئی واضح منصوبہ پیش نہیں کیا ہے لیکن ڈونلڈ ٹرمپ کو ایسے مذاکرات سے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا جس سے روس کو فائدہ ہو اور یوکرین کو اپنی کچھ زمین سے دستبردار ہونا پڑے۔

ڈونلڈ ٹرمپ یہ بھی متعدد بار کہہ چکے ہیں کہ وہ مشرقِ وسطیٰ کی جنگ ختم کرنا چاہتے ہیں اور غزہ میں جنگ بندی کو یقینی بنانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اس حوالے سے تفصیلات نہیں دیں لیکن گمان یہی ہوتا ہے کہ یہ جنگ بندی بھی اگر ہوگی تو وہ اسرائیل کی شرائط پر ہوگی۔ وہ کہہ چکے ہیں کہ امریکا کو شام میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے لیکن شام میں حکومت کی تبدیلی کے پیچیدہ علاقائی اثرات کے پیش نظر وہ کیسے امریکا کو اس معاملے سے دور رکھ پائیں گے، یہ دیکھنا اہم ہوگا۔

دنیا بھر میں جمہوریت کو چیلنجز کا سامنا رہے گا۔ گزشتہ چند سالوں میں جو رجحانات سامنے آئے ہیں وہ کسی صورت حوصلہ افزا نہیں۔ بہت سے ممالک میں سیاست زیادہ تقسیم کا شکار اور غیر مستحکم ہوتی جا رہی ہے۔ سیاست میں درمیانی راستے کی گنجائش ختم ہوتی جا رہی ہے جبکہ سیاسی مرکز عالمی سطح پر کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا تعلق دائیں بازو کے پاپولزم کے عروج سے ہے جس کا اثر و رسوخ یورپ کے کئی حصوں میں بڑھ رہا ہے جبکہ یہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

دنیا کے تقریباً تمام خطوں میں جمہوریت کمزور ہوئی ہے۔ بہت سے بین الاقوامی تنظیموں نے بھی کمزور ہوتی جمہوریت کو اجاگر کیا ہے جبکہ جتنے زیادہ ممالک میں 'آمرانہ طرزِ حکمرانی' بڑھی گی اور جمہوری حقوق اور آزادی کم ہوگی، یہ مسئلہ بڑھتا جائے گا۔ عالمی تھنک ٹینکس جو جمہوریت کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں، جمہوریت کے مستقبل کے حوالے سے مایوس ہیں۔ عوام کی توقعات سوشل میڈیا کی وجہ سے بڑھ چکی ہیں جبکہ سیاسی نظام ان معیارات اور توقعات پر پورا نہیں اتر پا رہے۔ عالمی خطرات کی پیش گوئی کرنے والی کچھ انٹیلی جنس کمپنیز نے کہا ہے کہ دنیا کے زیادہ تر خطوں میں بدامنی بڑھنے کے خدشات ہیں۔

آنے والے سال کا ایک اور سب سے بڑا چیلنج عالمی تجارتی جریدے گلوبل ٹریڈ ریویو کے مطابق 'گرے زون جارحیت پسندی' ہے۔ یہ ایسا خطرہ ہے جو بیان کرنا مشکل ہے لیکن اس کی تشخیص انتہائی ضروری ہے۔ اس میں غلط معلومات پھیلانے کی مہمات، سائبر حملے اور پراکسی وارز شامل ہیں۔ ایسے عوامل تنازعات اور امن کے وقت کے درمیان کی لکیر کو دھندلا دیتے ہیں۔

نئی طرز کی یہ جنگ دنیا بھر میں لڑی جا رہی ہے جس کی وجہ سے ممالک اس سے مقابلے کے لیے تیار نہیں ہوتے نہ ان کے پاس نمٹنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس سے 'بلیک سوان' (غیر متوقع) واقعات بڑھنے کے امکانات بھی بڑھ جاتے ہیں اور اچانک ہونے والی جغرافیائی سیاسی پیش رفت جن کے دور رس نتائج ہوتے ہیں، طاقت کے موجودہ توازن کو تبدیل کر سکتے ہیں اور اس سے نئے چیلنجز پیدا ہو سکتے ہیں۔

مصنوعی ذہانت کی دنیا میں ہونے والی ترقی پر بھی ۲۰۲۵ء میں نظر رکھنا ہوگی۔ کاروبار، دفاتر، انٹرٹینمنٹ، میڈیا، صحت عامہ اور ذاتی زندگیوں میں اے آئی ٹولز کا استعمال زیادہ عام ہو جائے گا۔ مصنوعی ذہانت پہلے ہی بہت سی تبدیلیاں لے کر آیا ہے۔ لیکن ٹیکنالوجی کی دنیا میں نئے چیلنجز جنم لیں گے جس میں سائبر سیکیورٹی کو بھی خطرات لاحق ہوں گے۔ ملٹری میں اے آئی کے استعمال سے بھی اضافی چیلنجز سر اٹھائیں گے۔

برطانوی تھنک ٹینک چیتھم ہاؤس کا خیال ہے کہ سال ۲۰۲۵ء میں اے آئی کی عالمی نگرانی پر زیادہ توجہ مرکوز کی جائے گی۔ اس نے فروری میں پیرس میں ہونے والی اے آئی

////// باقی صفحہ نمبر ۱۶ \\\\\\

ٹرمپ کی جیت میں 'ڈپلوما تقسیم' کا کردار

Zachary Schermele

حالیہ امریکی انتخابات میں کالج ڈگری نہ رکھنے والے ووٹرز میں کملا ہیرس کی مقبولیت چار سال قبل جو بائیڈن کی مقبولیت سے کم رہی۔ یہ ڈیموکریٹس کے لیے ایک بڑا مسئلہ۔

GOP یعنی Grand Old Party یا ریپبلکن پارٹی کی حالیہ انتخابات میں کامیابی کی اہم وجہ کالج کی ڈگری رکھنے والے اور ڈگری نہ رکھنے والے ووٹروں کے درمیان بڑھتا ہوا سیاسی اختلاف بھی ہے۔

ڈگری رکھنے والوں اور ڈگری نہ رکھنے والوں کے درمیان یہ خلیج، جسے diploma divide کا نام دیا گیا ہے (اور، اردو میں ہم اسے 'ڈپلوما تقسیم' کہہ سکتے ہیں)، طویل عرصے سے ڈیموکریٹس کے لیے ایک مسئلہ رہی ہے۔ یہ مسئلہ انتخابات کے دوران بظاہر مزید بگڑ گیا، سی این این کی رائے شماری (جو انتخابات کی محض ایک جھلک ہوتی ہے، اور ضروری نہیں کہ ہمیشہ درست ہو) سے ظاہر ہوا کہ کالج ڈگری رکھنے والے سفید فام ووٹروں میں کملا ہیرس کی مقبولیت ۲۰۲۰ء میں بائیڈن کی مقبولیت سے کہیں زیادہ رہی۔ جبکہ این بی سی نیوز کی ایسی ہی رائے شماری کبھی کالج نہ جانے والے ووٹروں میں ریپبلکن کی مقبولیت میں ۹ پوائنٹ کا اضافہ دکھایا گیا۔ ایسوسی ایٹڈ پریس اور واشنگٹن پوسٹ کی رائے شماری سے بھی ایسے ہی نتائج ملے۔

میٹ گراسمن جو مشی گن اسٹیٹ یونیورسٹی میں سیاسیات کے ماہر ہیں، نے کہا کہ ڈپلوما تقسیم گزشتہ انتخابات کے مقابلے میں اب کچھ بڑھ گئی ہے۔ کالج جانا ایک اعزاز کی بات ہے، ہر آدمی کالج نہیں جا سکتا اور شاید سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہر آدمی کالج جانا بھی نہیں چاہتا۔ البتہ، حالیہ عشرے میں، ڈگری کا ہونا، بلا کم و کاست پہلے سے کہیں زیادہ اہم معاشی ضرورت بن گیا ہے۔

چونکہ اس صدی کے آغاز میں کالج کی تعلیم بہت سے اداروں کے لیے ایک معیار بن گیا تھا تو کالج کی تعلیم بھی مہنگی ہوگئی اور طلبہ کے قرضوں میں اضافہ ہوگیا۔ پھر ایسے امریکیوں کی طرف سے جو دوسروں کے مالی خطرات کے لیے اپنی رقوم کو غیر منصفانہ طور پر نہیں چھوڑنا چاہتے، طلبہ کے قرضوں کی معافی کا معاملہ اٹھایا گیا، جس پر شدید سیاست اور تنقید کی گئی۔ ان تمام حالات نے دو بڑی سیاسی جماعتوں کے درمیان مخصصہ پیدا کر دیا کہ کس جماعت کو ووٹ دیا جائے۔

جون ولیمز جو یونیورسٹی آف کیلیفورنیا کالج آف لا کی پروفیسر اور نئی آنے والی کتاب Outclassed کی مصنفہ ہیں نے کہا کہ 'برسوں سے ڈیموکریٹس یہ حقیقت تسلیم کرتے چلے آئے ہیں کہ وہ ان ووٹروں سے جو کالج سے تعلیم یافتہ نہیں ہیں، ووٹ حاصل نہیں کر سکتے۔ مفروضہ یہ رہا ہے کہ ڈیموکریٹس غیر سفید فام ووٹروں میں بھاری اکثریت سے جیت کر اس کی تلافی کریں گے۔ لیکن، ایسا نہیں ہوا'۔

واشنگٹن پوسٹ کے مطابق، کالج ڈگری نہ رکھنے والے دو تہائی سفید فام امریکی مردوں نے اس انتخاب میں ٹرمپ کو ووٹ دیا۔ کالج ڈگری نہ رکھنے والی سفید فام خواتین میں یہ شرح ۶۰ فیصد رہی۔

عشروں سے ریپبلکنز کالجوں پر 'لبرل تعلیم' کا الزام عائد کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن ماہرین کا کہنا ہے کہ کالج سے تعلیم حاصل کرنے والے ووٹرز ہمیشہ بائیں بازو کی طرف جھکاؤ رکھنے والی اکثریت نہیں تھے۔ بیسویں صدی کے دوران، بیچلر ڈگری رکھنے والے امریکی 'جی او پی' کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ تاریخی طور پر یہ بات درست ہے کہ اعلیٰ تعلیم امیر گھرانوں سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کو غیر متناسب طور پر دستیاب تھی اور یہ گھرانے اکثر ریپبلکن تھے۔ یہ بات گراسمین نے کہی ہے جو Polarized by Degrees کے شریک مصنف ہیں۔

مؤرخ تھامس فرینک کی تحریروں کے مطابق، صدر رونلڈ ریگن نے ۱۹۸۰ء میں کالج ڈگری نہ رکھنے والے سفید فام ووٹروں کو ڈیموکریٹس سے دور کرنا شروع کیا۔ اب صورتحال یہ ہے کہ زیادہ روایتی بلیو کالر ڈیموکریٹس ایک ایسی پارٹی میں اپنے آپ کو کم تر سمجھ رہے تھے جو زیادہ مربوط دنیا کی عکاس تھی اور اسے ''اشرافیہ'' کی جماعت سمجھا جانے لگا ہے۔

''چنانچہ محنت کش طبقے کے ووٹرز نے خود کو حقیر سمجھنا شروع کر دیا''، تھامس فرینک نے یہ بات اپنی ۲۰۰۴ء میں شائع ہونے والی کتاب What's the Matter With Kansas میں لکھی ہے۔ 'جی او پی' کے رہنماؤں نے سیکھا کہ ان عام لوگوں کے ساتھ کیسے ہم آہنگی پیدا کی جائے۔

۲۰۰۸ء کے انتخابات میں بنیادی طور پر کچھ تبدیلی آئی۔ اس سال الینوئس کے سینیٹر بارک اوباما نے اریزونا کے جان میک کین کو شکست دی جو ایک ریپبلکن تھے۔

تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا جب یہ بات طے ہوگئی کہ کالج ڈگری رکھنے والے ووٹر ڈیموکریٹس کو ہی ووٹ دیتے ہیں۔ ۲۰۱۶ء میں، ڈگری نہ رکھنے والے سفید فام ووٹرز ریپبلکن پارٹی میں شامل ہوئے۔ گراسمین اور ہاپکنز کے مطابق، ایسے تقریباً دو تہائی ووٹرز کا جھکاؤ ریپبلکنز کی طرف رہا۔ ٹرمپ نے کامیابی کے ساتھ اس پاپولسٹ اپیل کا فائدہ اٹھایا اور وہ جلد ہی ریپبلکنز کا برانڈ بن گئے۔

سیاسی درستی کے بارے میں ٹرمپ کی عدم توجہی اور پالیسی کی باریکیوں میں عدم دلچسپی نے ان ووٹرز کو زیادہ متاثر کیا، جو اُن سے ثقافتی تعلق محسوس کرتے تھے۔

ڈپلوما تقسیم کا یہ تسلسل ۲۰۲۰ء میں بھی جاری تاہم حالیہ انتخابات میں یہ تقسیم زیادہ واضح دکھائی دی۔ سادہ طور پر گراسمین کے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب ڈیموکریٹس کی شبیہہ کام کرنے والے طبقے (ورکنگ کلاس) کی نمائندہ جماعت کے طور پر نہیں ابھرتا۔

براک اوباما نے اپنے پہلے دور صدارت کے آغاز میں یہ ہدف طے کیا تھا کہ امریکا میں دنیا کے سب سے زیادہ کالج گریجویٹس ہوں۔ لیکن بعد میں ''کالج سب کے لیے'' کے بیانیے پر زور نہیں دیا گیا، خاص طور پر جب کمیونٹی کالجز کو آزاد بنانے کی کوششیں ناکام ہوگئیں تو یہ ہدف پس پشت ڈال دیا گیا۔ اس کے مقابلے میں دیگر تعلیمی ذرائع کو وسعت دینا، جیسے پیشہ ورانہ پروگرام اور اپرنٹس شپ، حالیہ برسوں میں ڈیموکریٹس کے لیے زیادہ راحت رساں گفتگو کا نقطہ بن گیا ہے۔

حالیہ انتخابات سے قبل کملا ہیرس نے یہ وعدہ کیا کہ وہ اپنے صدارتی دور کے پہلے دن وفاقی حکومت کے بعض عہدوں کے لیے ڈگری کی شرط کو ختم کر دیں گی۔ یہ واضح نہیں ہے کہ کتنے لوگوں نے اس وعدے پر کان دھرے، لیکن چند روز بعد، بہت سے لوگ جو اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے، انہوں نے بیلٹ باکس میں اُن کے خلاف ووٹ ڈالا۔

سان فرانسسکو کے پروفیسر ولیمز کہتے ہیں کہ اقتدار میں نہ ہوتے ہوئے ڈیموکریٹس کو ان ووٹروں کو واپس جیتنے کے لیے بہت زیادہ کام کرنا ہوگا جو انہوں نے کھو دیے ہیں۔ کالج نہ جانے والے ووٹرز کو لگتا ہے کہ وہ واقعی معاشی طور پر کمزور ہیں۔ وہ ایسے نظام کو برقرار رکھنے میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے جو ''امریکی خواب'' کو نگل گیا ہے۔ (ترجمہ: سید عرفان احمد)

"How the 'diploma divide' helped steer Trump back to the White House".
("usatoday.com". November 12, 2024)

مشرقِ وسطیٰ میں "قضیۂ کُرد"

افتخار گیلانی

شام میں بشار الاسد حکومت کی برطرفی کے بعد گو کہ اپوزیشن سیرین نیشنل آرمی نے ملک کے بیشتر علاقوں پر کنٹرول حاصل کرلیا ہے، مگر اب پوری توجہ شمال مشرقی شام کی طرف مرکوز ہوگئی ہے، جو ایران، ترکیہ اور عراق کی سرحدوں کے ساتھ ملحق ہے۔

یہ علاقے امریکی حمایت یافتہ کرد قیادت والے سیرین ڈیموکریٹک فورسز (ایس ڈی ایف) کے قبضے میں ہیں۔

کرد گو کہ شام کی آبادی کا دس فیصد ہیں، مگر اس وقت وہ شام کے ۳۰ فیصد علاقے پر قابض ہیں، جن میں کئی عرب اکثریتی والے قصبے اور دیہات بھی شامل ہیں۔

ترکیہ اور عرب ممالک شام میں ایک مضبوط مرکزی انتظام کے خواہاں ہیں، مگر امریکا عراق کی طرز پر شام میں ایک ایسا وفاقی ڈھانچا بنانے کے فراق میں ہے، جہاں کردوں کے ذریعے شمال مشرق میں قائم آٹانامس ایڈمنسٹریشن آف نارتھ اینڈ ایسٹ سیریا (اے اے این ای ایس) کو مکمل خود مختاری حاصل ہو اور دوسری طرف اس ملک کی سب سے اہم بندرگاہ لطانیہ اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر علوی فرقہ اور پھر گولان پہاڑوں کے آس پاس کے علاقہ کو فرقہ دروز کے حوالے کر کے ان کی نیم خود مختاری پر مہر لگائی جائے۔

کرد قوم، جو ۵۰ ملین سے زائد افراد پر مشتمل ہے، ایک ایسا نسلی گروہ ہے جن کی اپنی کوئی ریاست نہیں ہے۔ تاریخی شواہد کے مطابق، ترکوں کے برعکس کرد مشرق وسطیٰ کے مقامی لوگ ہیں۔ ترک وسطی ایشیا اور دیگر خطوں سے ہجرت کر کے اس علاقے میں آبسے ہیں۔ کرد ایک وسیع جغرافیائی علاقے میں آباد ہیں، جن میں ایران، آذربائیجان، آرمینیا، جارجیا، اردن، بلقان اور روس شامل ہیں۔ مگر ان کی نمایاں موجودگی ترکیہ، ایران، عراق اور شام میں ہی ہے۔

روس کی ایک ریاست کا نام بھی بشکردستان ہے۔ شاید ماضی میں اس خطے میں کردوں کی اکثریت رہی ہوگی۔

اس قوم کی تاریخ بغاوتوں، دھوکوں، جنگ و جدل اور مختصر کامیابیوں سے بھری پڑی ہے۔ کرد زبان، جس میں کرمانجی، سورانی، اور زازا بولیاں شامل ہیں، یورپی لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں، جو عربی، فارسی، اور ترکی سے منفرد ہے۔ کردوں نے تاریخ میں کئی آزاد ریاستیں قائم کی ہیں، جیسے کہ متانی، مادی، شداڈی، بوتان امارات، حکاری امارات، مروانی ریاست، ایوبی سلطنت اور آخری خود مختار کرد ریاست موجودہ ایران میں مہ آباد جمہوریہ تھی۔

کرد قوم نے قابل ذکر شخصیات پیدا کی ہیں، جیسے کہ صلاح الدین ایوبی، جنہوں نے صلیبیوں کو شکست دے کر ۱۱۸۷ء میں یروشلم کو فتح کرلیا تھا۔ گو کہ کرد ۹۰ فیصد سنی مسلمان ہیں، مگر علوی کرد بھی موجود ہیں۔ مسلمانوں میں زیادہ تر شافعی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔ جبکہ ترکوں کی غالب اکثریت حنفی مسلک سے منسلک ہے۔

عرب ممالک کے ساتھ ان کی رسہ کشی اس وقت شروع ہوئی جب ان ممالک میں عرب قوم پرستی کے نام پر سوشلسٹ بعث پارٹی نے غلبہ حاصل کرلیا اور اس طرح ترکیہ میں جب سخت گیر سیکولرازم نے مذہبی پابندیاں عائد کیں تو انہوں نے اس کے خلاف بغاوت کی۔ جس کی وجہ سے ۱۹۳۰ء کی دہائی میں دوبار ان کا قتل عام ہوا۔ کرد پٹھانوں کی طرح خاصے مذہبی مانے جاتے ہیں۔ اس کا اندازہ مشرقی ترکیہ کے کرد اکثریتی صوبوں دیاربکر اور شانلی عرفہ وغیرہ کا دورہ کرنے سے ہوتا ہے۔

ترک اکثریتی علاقوں کے برعکس یہاں مساجد نمازیوں سے خاصی بھری ہوتی ہیں۔ مگر یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ ایران، عراق، شام اور ترکیہ میں کردوں کے ساتھ رقابت اور سیاسی کشیدگی کی وجہ سے یہ نسلی گروہ موجودہ حالات میں اس خطے میں اسرائیل اور امریکا کا حلیف تصور کیا جاتا ہے۔

بشار الاسد کے سقوط کے بعد اسرائیل شام پر لگاتار بمباری کر کے اس کی دفاعی تنصیبات کو ختم کر کے ایک طرف اس کو اس حد تک غیر محفوظ بنانا چاہتا ہے کہ وہ اسرائیل کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی ہمت نہ کرے اور دوسری طرف کرد علاقہ اے اے این ای ایس کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے۔ یعنی کرد علاقوں کی خود مختاری کا دفاع اسرائیل نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے اسرائیل کردوں کے قائم کردہ علاقے کی سرحد گولان میں دروز علاقے تک بڑھانا چاہتا ہے، تاکہ اس کی سرحدوں کے آس پاس عرب آبادی کا انخلا کر کے وہاں کرد اور دروز آبادی کو بسا کر ان کو دائمی طور پر محفوظ کرے، دوسری طرف کردوں کے ذریعے ترکیہ کو بھی عدم استحکام سے دوچار کردے۔

شمال مشرقی شام کی خود مختار انتظامیہ میں کرد عسکری گروپ وائی پی جی (پیپلز پروٹیکشن یونٹس) کا غلبہ ہے۔ یہ گروپ سیرین ڈیموکریٹک فورسز (ایس ڈی ایف) کا اہم حصہ ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ہیت تحریر الشام یعنی ایچ ٹی ایس سیرین نیشنل آرمی (ایس این اے) کا اہم اور غالب جزو ہے۔

وائی پی جی کی قیادت میں ایس ڈی ایف نے امریکی حمایت کے ساتھ داعش کو شکست دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ صدر براک اوباما کی قیادت میں اس وقت کی امریکی انتظامیہ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ داعش کے خاتمے کے بعد شمال مشرقی شام میں ان کو ایک خود مختار علاقہ عطا کیا جائے گا۔ اس سے قبل ان کو ویسا ہی علاقہ امریکی مدد سے شمالی عراق میں کردستان ریجنل گورنمنٹ کے نام سے دیا گیا تھا۔

مگر امریکا کے ناٹو اتحادی ترکیہ نے شام میں کرد قوتوں کے ابھرنے کو ایک براہ راست خطرہ سمجھا۔ ترکیہ کے مطابق وائی پی جی ممنوعہ دہشت گرد گروپ کردستان ورکرز پارٹی (پی کے کے) کی ہی شاخ ہے، جو ترکیہ میں برسرپیکار ہے۔ پی کے کے کے ساتھ چالیس سالہ جنگ میں ترکیہ میں ۴۰ ہزار ہلاکتیں ہوئی ہیں۔

اس خطرے کا سدباب کرنے کے لیے ترک صدر رجب طیب ایردوان نے دو اہم فوجی آپریشن کرا کے اپنی سرحد پر بفرزون قائم کروائے۔ ۲۰۱۶ء میں آپریشن فرات شیلڈ نے داعش کو نشانہ بنایا لیکن ساتھ ہی فرات کے مغرب میں کرد پیش قدمی کو بھی روکا۔ ۲۰۱۹ء میں آپریشن پیس اسپرنگ نے براہ راست کرد فورسز کو کمزور کرنے کا ہدف بنایا، اور تل ابیض اور راس العین پر قبضہ کر کے وہاں فوجی تعینات کیے۔

کردوں کو روکنے کے لیے ترکیہ نے شامی اپوزیشن ایس این اے کی بھی بھرپور علانیہ مدد کر کے ان کو ڈرونز اور جیٹس فراہم کرائے جس کی وجہ سے اپوزیشن نے کردوں سے دو اہم شہر تل رفعت اور منبج ہتھیا لیے۔

بتایا جاتا ہے کہ ان علاقوں میں مقامی عرب قبائل خود مختار کرد انتظامیہ سے منحرف ہوگئے اور انہوں نے دمشق کی انتظامیہ کے ساتھ الحاق کر کے ایس این اے سے مدد مانگی۔ ایس ڈی ایف کے کمانڈر ان چیف مظلوم عابدی نے ان علاقوں پر ایس این اے کے قبضے اور مقامی عرب کمانڈروں کے منحرف ہونے کی تصدیق کی۔

ایک کرد کمانڈر مظلوم کوبانی کا کہنا ہے کہ ان کی جدوجہد صرف بقا کے لیے نہیں بلکہ عزت اور پہچان کے لیے ہے۔

کرد علاقے میں متعدد امریکی فوجی اڈے ہیں، مگر کوبانی کا کہنا ہے کہ انہوں نے ان کی کوئی مدد نہیں کی۔

ان کا کہنا تھا کہ امریکی قومی سلامتی کے مشیر جیک سلیوان نے یقین دلایا تھا کہ بائیڈن انتظامیہ شام میں اپنے اتحادیوں کے ساتھ کھڑی رہے گی۔ کیونکہ کرد اس جیل کی بھی حفاظت کر رہے ہیں، جس میں داعش سے وابستہ جنگجو اور ان کے افراد خانہ قید ہیں۔

معروف ترک صحافی و دانشور مہمت اوزترک کے مطابق کرد مسئلہ بڑی حد تک پہلی عالمی جنگ کی میراث ہے۔ کرد زیادہ تر سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھے، جہاں صرف مذہبی اقلیتوں کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ چونکہ کرد زیادہ تر مسلمان ہیں، انہیں ایک علیحدہ نسلی گروہ کے طور پر تسلیم نہیں کیا گیا۔ سلطنت عثمانیہ کے تحت، کرد سلطنت کے اہم ستون تھے، جو پہاڑی علاقوں اور سرحدوں کی حفاظت کے ذمہ دار تھے۔ لیکن سلطنت عثمانیہ کے زوال کے بعد، ترکی میں ان کے خلاف پالیسیاں تبدیل ہو گئیں۔

اوزترک کے مطابق، جب ۱۹۲۳ء ایک سیکولر حکومت نے عثمانیوں کی جگہ لی تو اس وقت کی ترک حکومت نے ان کی مذہب کے ساتھ زیادہ وابستگی کی وجہ سے ان کو تختہ مشق بنا دیا۔ ترک حکومت نے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء میں تُنسلی کو بمباری کا نشانہ بنایا تا کہ کردوں کی بغاوت کو دبایا جا سکے، جو 'درسیم بغاوت' کے نام سے جانی جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں قتلِ عام ہوا۔

موجودہ صدر رجب طیب ایردوان نے ۲۰۱۱ء میں ترکی ریاست کی طرف سے درسیم قتلِ عام پر معافی مانگی۔ مگر یہ علاقے چونکہ شورش کی زد میں تھے، اس لیے ترقی سے محروم اور عسرت میں رہے۔ یہ بھی شورش کے جاری رہنے کا ایک باعث بنا۔ پھر ۱۹۸۰ء سے پہلے کا ترکیہ کا معاشرہ شدید طور پر تقسیم کا شکار تھا، جس کے نتیجے میں بائیں بازو اور دائیں بازو کے انتہا پسندوں کے درمیان جھڑپیں ہوتی تھیں، جن میں تقریباً ۵۰۰۰ا/ا افراد ہلاک ہوئے۔ ۱۹۸۰ء کی فوجی بغاوت کے بعد، کرد عسکری تنظیم پی کے کے (کُردستان ورکرز پارٹی) نے گوریلا جنگ کا آغاز کیا۔

انقرہ یونیورسٹی کے کرد طلبہ کی قائم کردہ اس تنظیم کا نظریہ مارکسزم لیننن ازم اور نسلی علیحدگی پر مبنی تھا۔ پی کے کے کو بین الاقوامی حمایت حاصل ہوئی اور اس نے ترکیہ کی سکیورٹی فورسز کو بڑے پیمانے پر چیلنج کیا اور جنوب مشرقی علاقوں کے بڑے شہروں میں اثر و رسوخ حاصل کر لیا۔

ترکیہ نے شام پر بغاوت کی حمایت اور پی کے کے کے رہنما عبداللہ اوجلان کو پناہ دینے کا الزام لگایا۔ کشیدگی بڑھنے اور ترکیہ کی طرف سے حملے کی دھمکیوں کے بعد، شام نے سفارتی دباؤ کے تحت اوجلان کو ملک بدر کر دیا۔

اوجلان کو مختلف ممالک میں پناہ کی تلاش کے دوران ۱۹۹۹ء میں کینیا میں ترکیہ کی انٹیلی جنس نے گرفتار کیا اور اس کو ترکیہ کے حوالے کیا گیا۔ مقدمے میں انہیں ۳۰،۰۰۰ افراد کی ہلاکت کا ذمہ دار قرار دے کر عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ اوزترک کا کہنا ہے کہ شام نے تو خود کردوں کی شہریت ہی رد کر دی تھی، مگر ترکی میں ان کی کارروائیوں کی حمایت کرتا تھا۔

کرد عسکری تنظیم نے بعد میں سیاست میں بھی قسمت آزمائی کر کے سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ آج کل یہ پیپلز ایکویلیٹی اینڈ ڈیموکریسی پارٹی (ڈی ایچ پی) کی نام سے سرگرم ہے اور ملک کی تیسری بڑی سیاسی قوت ہے۔

ترک پارلیمان میں اس کے اراکین کی تعداد ۵۷ ہے۔ ایک اور کرد پارٹی، ہُدا۔پار، جو اسلام پسند کردوں کی نمائندگی کرتی ہے کے بھی چار اراکین پارلیمان ہیں، اس کو ترکیہ کی حزب اللہ کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ رجب طیب اردگان کی آق پارٹی نے جب اقتدار سنبھالا تو اس میں کرد اراکین پارلیمنٹ کی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔

ترکیہ کی موجودہ حکومت میں کئی کرد وزرا شامل ہیں، جن میں نائب صدر جودت یلماز اور وزیر خارجہ حقان فیدان شامل ہیں۔ اس وقت بھی ان کی پارٹی میں کرد اراکین پارلیمان کی تعداد ۶۰ کے آس پاس ہے۔

پچھلے صدارتی انتخابات میں جس امیدوار کمال کلچی داراولو نے ایردوان کو کانٹے کی ٹکر دی، وہ بھی کرد ہی ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ وہ سنی کرد کے بجائے علوی کرد ہیں، جو ایک نہایت ہی چھوٹی اقلیت ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ کرد ترکیہ کی آبادی کا تقریباً ۱۵-۲۰ فیصد ہیں، مگر ان کی شرح پیدائش ترکوں سے پانچ گنا زیادہ ہے۔ یہ رجحان مستقبل میں آبادی کے توازن میں نمایاں تبدیلی کے امکانات کو بڑھاتا ہے۔

آج، ترکیہ میں تقریباً چالیس لاکھ مخلوط خاندان ہیں جہاں کردوں کی غیر کردوں سے شادیاں ہو چکی ہیں۔ دنیا کا سب سے بڑا کرد آبادی والا شہر اس وقت استنبول ہی ہے۔ عراق میں کردوں کا ایک خودمختار علاقہ ہے جسے کردستان ریجنل آٹونومس گورنمنٹ کہا جاتا ہے۔ عراق کے موجودہ صدر عبداللطیف راشد اور وزیر خارجہ فواد حسین بھی کرد ہیں۔ اس علاقے پر دو بڑی کرد جماعتوں، برزانی اور طالبانی، کا غلبہ ہے، جو اثر و رسوخ کے لیے آپس میں برسرپیکار رہتی ہیں۔

شام میں خانہ جنگی سے قبل، کردوں کو سخت امتیازی سلوک کا سامنا تھا، جن میں شہریت کے حقوق سے محرومی بھی شامل تھی۔ خانہ جنگی کے دوران کردوں نے امریکا کے ساتھ اتحاد کیا اور مغربی حمایت کے ذریعے اب شام کے تقریباً ۳۰ فیصد علاقے پر قابض ہیں۔ ایران میں بھی ترکیہ کی طرح کردوں کو ایک الگ نسلی گروہ کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا ہے۔ انہیں سنی مسلمان ہونے اور ایک الگ نسلی گروہ ہونے کی وجہ سے دوہرے امتیاز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ترکیہ میں ۱۹۸۰ء کی فوجی بغاوت کے بعد کرد زبان پر پابندی لگا دی گئی، اور عوامی مقامات پر بولنے کی اجازت نہیں تھی۔ کرد طویل عرصے سے اپنی مادری زبان میں بنیادی تعلیم کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایردوان کی آق پارٹی نے اقتدار میں آنے کے بعد ۲۰۰۲ء سے کئی پابندیاں ختم کر دی تھیں۔ سرکاری ٹی آر ٹی نیٹ ورک کے ذریعے کرد زبان کا ایک ٹی وی چینل شروع کیا گیا اور سرکاری اناطولو نیوز ایجنسی میں ایک کرد زبان کا ونگ قائم کیا گیا۔

جاتے جاتے بشار الاسد، جو پوری عمر کردوں کے ساتھ نبرد آزما رہے، نے ایک چال چلی تھی۔ نومبر کے وسط میں جب حزب اللہ نے لبنان میں اسرائیل کی طرف سے مسلط کردہ جنگ کی وجہ سے اپنی پوسٹس کو خالی کیا، تو شام کی سرکاری افواج نے ان کو کردوں کی تحویل میں دینے کا فیصلہ کیا۔ مگر ۲۷ نومبر کو ترکیہ نے ایس این اے کو متحرک کر کے ان پوسٹوں کو کردوں سے واپس لینے کی ترغیب دی۔

ایس این اے جو ابھی تک صرف ادلب تک محدود تھیں، نے حلب کے آس پاس ان ملٹری پوسٹوں کو کردوں سے چھڑا لیا، تو معلوم ہوا کہ شہر میں کسی طرح کی مزاحمت نہیں ہے۔ بالکل جس طرح امریکی انخلا کے اعلان کے بعد افغانستان میں اشرف غنی کی سرکاری افواج ہتھیار ڈالتی گئی، بالکل اسی طرح دمشق تک ایس این اے کو کسی بھی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

کردستان نیشنل کانگریس کی خارجہ پالیسی کمیٹی کی ترجمان نیلوفر کوچ کا کہنا ہے کہ کرد مسئلہ کا واحد حل وفاقیت اور غیر مرکزیت والی حکومت کے قیام میں ہے۔

ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ کردوں کا مقصد عراق یا شام میں علیحدہ خطے کا قیام نہیں ہے، بلکہ جمہوری ڈھانچے کے اندر خودمختاری اور بقائے باہمی ہے۔

\\\\\ باقی صفحہ نمبر ۹ /////

شام میں امریکی مداخلت ناگزیر

Alon Ben-Meir

امریکا نے شام کے معاملات میں مداخلت کا سلسلہ کبھی ختم نہیں کیا۔ جب وہاں خانہ جنگی ہو رہی تھی تب بھی امریکا روس اور ایران کی مداخلت کو ناکام بنانے کے لیے سرگرم تھا اور اب بھی وہ نئی حکومت کا ساتھ دینے کے نام پر شام کے معاملات میں مداخلت کر رہا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ کی آمد کے بعد صورتحال کیا ہوگی۔ ڈونلڈ ٹرمپ کہہ چکے ہیں کہ امریکا کو دنیا بھر میں جگہ جگہ مداخلت سے باز رہنا چاہیے اور اپنے معاملات درست کرنے پر زیادہ توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔

بشارالاسد انتظامیہ کا اچانک دھڑن تختہ ہو جانے کے بعد اب امریکا کے لیے لازم ہو چکا ہے کہ شام میں مداخلت کر کے ایران اور روس کے اثرات کو ختم کرے اور نئی حکومت کو مضبوط کرے۔ شام کے حالات نازک ہیں۔ معیشت بھی زوال پذیر ہو چکی ہے۔ ایسے میں ملک کو مستحکم کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ امریکا اور یورپ کی طرف سے امداد بڑھائی جائے اور جہاں تک ممکن ہو، نئی حکومت کے لیے استحکام کا سامان کیا جائے۔ شام میں مداخلت سے صرف حکومت مضبوط نہیں ہوگی اور شام کے عوام کا بھلا نہیں ہوگا بلکہ خود امریکا کے مفادات کو بھی تحفظ حاصل ہوگا اور وہ اس خطے میں اپنے اسٹریٹجک معاملات کو بالادستی کے ساتھ نپٹانے میں کامیاب رہے گا۔

اب بنیادی سوال یہ ہے کہ امریکا کو شام کے حوالے سے کیا اقدامات کرنے چاہئیں اور دوسری طرف ڈونلڈ ٹرمپ کی پالیسی سے نپٹنے کے لیے کیا کیا جائے کیونکہ وہ بارہا کہہ چکے ہیں کہ امریکا کو اپنے معاملات پر زیادہ توجہ دینی چاہیے اور دنیا بھر میں مداخلت کرنے سے حتی الوسع گریز کرنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ ڈونلڈ ٹرمپ جب دوسری بار امریکی صدر کا منصب سنبھالیں تو شام کے حوالے سے کچھ اور فیصلہ کریں۔ بشارالاسد کی حکومت کے گرائے جانے کے فوراً بعد ڈونلڈ ٹرمپ نے کہا تھا کہ شام کے حالات بہت خراب ہیں مگر خیر، وہ ہمارا دوست نہیں ہے۔ جو کچھ شام میں ہو رہا ہے، اُس سے امریکا کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ ہماری لڑائی نہیں ہے۔ اس لڑائی کو ہونے دیا جائے۔ اس میں ملوث ہونے کی فی الحال کوئی ضرورت نہیں ہے۔

خطے کے لیے بُرے اثرات

اگر ڈونلڈ ٹرمپ اپنی بات پر قائم رہے تو اور امریکا کو شام کے معاملات میں مداخلت سے باز رکھا تو خطے کے لیے اس کے نہایت سنگین اثرات ہوں گے۔ شام میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ انتہائی خطرناک ہے اور امریکا و یورپی یونین کی مداخلت کے بغیر وہاں استحکام نہ آسکے گا اور نئی خانہ جنگی کی صورت میں پورا خطہ ایک بار پھر انتہائی نوعیت کی صورتحال سے دوچار ہو جائے گا۔

امریکا کے پاس اس وقت شام میں مداخلت کے سوا چارہ نہیں۔ یہ انگیجمنٹ طویل المیعاد ہونی چاہیے تاکہ وہاں کسی اور بیرونی طاقت کو قدم جمانے کا موقع نہ مل سکے۔ اگر شام کی نئی حکومت کو تمام فیصلے خود کرنے کی آزادی ملی تو وہ ایسا کر نہیں پائے گی کیونکہ ملک کے حالات بہت نازک ہیں۔ کئی قوتیں اب بھی وہاں حکومت کو کمزور کرنے کے درپے ہیں۔ اگر شام کی نئی حکومت کے فیصلے بیک فائر کر گئے تو امریکا اور اس کے اتحادیوں کے مفادات کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔ یہ سب کچھ روکا جاسکتا ہے مگر اس کے لیے بروقت اقدامات لازم ہیں۔ تعمیری اقدامات کے ذریعے شام کو مضبوط بھی کیا جاسکتا ہے اور امریکا و اتحادیوں کے مفادات کی تکمیل کے لیے بروئے کار بھی لایا جاسکتا ہے۔

ڈونلڈ ٹرمپ کو بہت تیزی سے یہ احساس ہو جائے گا کہ مشرقِ وسطیٰ جیسے ڈانواڈول خطے میں شام کے معاملات سے الگ تھلگ رہنا امریکا اور اس کے اتحادیوں کے مفادات کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہوگا۔ مداخلت کی صورت میں بھی امریکا کے لیے خطرات کم نہیں، تاہم عدمِ مداخلت کی صورت میں خطرات کہیں زیادہ ہوں گے اور اُن کی شدت بھی زیادہ ہوگی۔

شام سمیت کہیں بھی مداخلت کی صورت میں امریکا کے لیے خطرات تو یقیناً ہوں گے تاہم امریکی مفادات کا تحفظ یقینی بنانے کے لیے مداخلت لازم ہو تو ایسا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ مداخلت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خطرات کا سامنا کرنے کے لیے بھرپور جامع پالیسی مرتب کر کے متعلقہ لائحہ عمل تیار کیا جائے تاکہ منفی اقدامات کے منفی نتائج کا سامنا کرنے کی سکت موجود رہے۔ شام میں امریکی مداخلت ناگزیر ہے، اس لیے اِس سے بھاگنے کی کوشش انتہائی نقصان دہ ثابت ہوگی۔ اگر امریکا نے شام کو نظرانداز کیا تو وہاں ایران، روس اور ترکی دوبارہ قدم جمانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ تینوں ممالک اپنے اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے ایک بار پھر شام کو میدانِ جنگ بنانے میں دیر نہیں لگائیں گے۔

امریکا کے لیے چیلنج

ایسا نہیں ہے کہ امریکا طاقتور ہے تو اس کے لیے کوئی بڑا چیلنج ہے ہی نہیں۔ کسی بھی ملک کی طرح امریکا کو بھی چیلنج درپیش ہیں۔ سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ شام میں نئی حکومت کئی گروپوں پر مشتمل ہے۔ ایسی حکومت سے رابطے رکھنا آسان نہیں کیونکہ مفادات مختلف النوع ہیں اور جن کے ہاتھ میں اختیار ہے، وہ مختلف نظریات کے لوگ ہیں۔

شام کو پابندیوں کا سامنا رہا ہے اور کئی ممالک نے شام میں بشارانتظامیہ سے اشتراکِ عمل جاری رکھا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ شام پر سے پابندیاں کس طور اٹھائی جائیں اور جن ممالک نے بشارانتظامیہ سے تعاون کیا تھا، اُن سے کس طور نپٹا جائے اور اُن کے خلاف کیا اقدامات کیے جائیں۔

شام کے پڑوسیوں سے متوازن تعلقات استوار رکھنا بھی کچھ کم چیلنج نہیں۔ ترکی اور دیگر ممالک سے امریکا کو ایسے تعلقات استوار رکھنا ہیں جن کے نتیجے میں شام میں امریکی فوج کی موجودگی بُری محسوس نہ ہو، اور معاملات بہتری کی طرف جائیں۔

شام میں کرد بھی ہیں جو چاہتے ہیں کہ یا تو اُن کی الگ ریاست قائم ہو یا پھر ریاست قائم نہ ہونے کی صورت میں اُنہیں اندرونی علاقائی خودمختاری یا نیم خودمختاری دی جائے۔ امریکا کے لیے اس معاملے سے نپٹنا بھی آسان نہ ہوگا۔ ذرا سی غلطی شام میں نئی خانہ جنگی شروع کرواسکتی ہے۔

شام کی معیشت کا بھٹہ بیٹھ چکا ہے۔ لازم ہے کہ اُسے معاشی اعتبار سے اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے سرمایہ کاری بھی کی جائے اور تجارت کا دائرہ بھی وسیع کیا جائے۔ شام کی نئی حکومت کو شدید مالی مشکلات کا سامنا ہے۔ ایسے میں امریکا اور اُس کے اتحادیوں کے لیے اچھا موقع ہے کہ آگے بڑھ کر شام کی معیشت کو مستحکم بنانے میں اپنا کردار ادا کریں اور تعلقات بہتر بنائیں۔ ایسی صورت میں امریکا اور اُس کے اتحادیوں کو شام میں قدم جمانے کا بھرپور موقع بھی مل سکے گا۔

ان میں سے کوئی بھی چیلنج آسان نہیں اور پوری توجہ کا طالب ہے۔ یہ وقت بہت اہم ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں بہت کچھ تبدیل ہو چکا ہے۔ غزہ کی صورتحال سب کے سامنے ہے۔ شام میں جو کچھ بھی ہوا ہے، وہ بھی ڈھکا چھپا نہیں۔ ایسے میں امریکا کی ذمہ داری بڑھ گئی ہے۔ اُسے ثابت کرنا پڑے گا کہ وہ اب بھی

ایک مضبوط عالمی قوت ہے اور اپنی بات منوانے کی پوزیشن میں بھی ہے۔ امریکی حکومت شام کے حوالے سے کوئی بھی جامع فیصلہ جس قدر جلد کرے، اُتنا ہی اچھا ہے۔ جب امریکا اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے شام کے حوالے سے کوئی بڑا کردار ادا کرنے لگے گا تو دوسرے ممالک بھی اُس کے نقوشِ قدم پر چلیں گے اور یوں شام کی نئی حکومت کے لیے کام کرنا آسان ہوجائے گا اور ملک تیزی سے استحکام کی طرف بڑھے گا۔

امریکا کو کیا کرنا چاہیے؟

امریکی صدر جو بائیڈن نے بالکل درست کہا ہے کہ نئی حکومت آزادی، مساوات، قانون کی حکمرانی اور جمہوریت کے حوالے سے اپنے وعدوں اور دعوؤں سے نہیں بلکہ اپنے اقدامات سے پہچانی جائے گی۔

امریکا میں بھی حکومت تبدیل ہونے والی ہے۔ نئی (ٹرمپ) انتظامیہ کے لیے شام کی صورتحال ایک بڑے چیلنج کی صورت رکھتی ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ کہہ چکے ہیں کہ امریکا کو دنیا بھر میں مداخلت سے گریز کرنا چاہیے۔ بات ٹھیک ہے مگر ایک خاص حد تک۔ امریکا کو کہیں بھی بلاجواز مداخلت سے گریز ہی کرنا چاہیے تاہم جب معاملہ قومی مفادات کا ہو تو غیر جانبدار اور الگ تھلگ رہا نہیں جاسکتا۔

صدر بائیڈن کو کیا کہنا چاہیے؟

اس وقت شام کی حالت قابلِ رحم ہے۔ صدر بائیڈن کو کہنا چاہیے ''اے شام کے لوگو! تم نے آمریت کے خلاف جنگ جیت لی ہے۔ تمہاری فتح نے ایک نئی ابتدا کی راہ ہموار کی ہے۔ وقت آگیا ہے کہ شامی قوم کے زخم مندمل ہوں۔ امریکا اپنا کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔ وہ چاہے گا کہ شام میں امن ہو، استحکام ہو، معاشی مضبوطی آئے۔ امریکا دستِ تعاون دراز کرنے کے لیے تیار ہے۔ امریکا چاہے گا کہ شام میں بنیادی حقوق کا تحفظ یقینی بنایا جائے، کوئی کسی کی حق تلفی نہ کرے، کوئی کسی کو بے جا طور پر پریشان نہ کرے۔

شام کے لوگوں نے ایک طویل مدت تک عدم استحکام جھیلا ہے۔ بشارالاسد اور اُن سے قبل اُن کے والد حافظ الاسد نے ملک پر طویل حکمرانی کی ہے۔ باپ بیٹے کی مجموعی حکمرانی پچاس سال سے زیادہ کی رہی ہے۔ اس دوران اُنہوں نے جو کچھ بھی چاہا، کُھل کر کیا۔ شام کے لوگوں پر جو مظالم ڈھائے گئے، وہ اُن کی طاقت سے یعنی قوتِ برداشت سے کہیں زیادہ تھے جس کے باعث اُن کی زندگیاں تاراج ہوگئیں۔ اب وقت آچکا ہے کہ اُن کے زخموں پر مرہم رکھا جائے اور اُنہیں سلامتی کے احساس سے سرشار کیا جائے۔ ملک کو تعمیرِ نو کے مرحلے سے گزرنا ہے۔ لوگوں کا اعتماد بحال کرنا ہے۔ یہ سب کچھ خود بخود نہیں ہوسکتا۔ عالمی برادری کو اس عمل میں اپنا کردار ادا کرنا ہے اور سب سے بڑھ کر امریکا کو اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے آگے بڑھنا ہے۔ اگر تساہل برتا یا جھجک محسوس کی تو نقصان ہی پہنچے گا۔

شام کے لوگوں کو اپنے بارے میں سوچنا ہے۔ اگر وہ انتقام لینے پر تُل گئے تو ایک بار پھر شدید پسماندگی کے گڑھے میں جا گریں گے۔ لازم ہے کہ وہ تشدد کی راہ سے ہٹ کر تعمیر اور ترقی کی راہ پر گامزن ہوں۔

یہ وقت بہت نازک ہے!

امریکا کو بہت کچھ کرنا ہے۔ شام میں ہر طرف انتشار ہے۔ سیاسی اور معاشی عدمِ استحکام نے مل کر معاملات کو انتہائی خرابی سے دوچار کیا ہے۔ لازم ہے کہ شام کے عوام اور حکومت، دونوں کا ہاتھ تھام کر امریکا اور دیگر طاقتیں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے آگے بڑھیں۔ امریکا کو مختلف مثبت اقدامات کے ذریعے یہ پیغام دینا ہے کہ وہ شام کے معاملات کو بہتر بنانے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ شام کی نئی حکومت میں اپنے حوالے سے اعتماد پیدا کرنا نئی (ٹرمپ) انتظامیہ کی ذمہ داری ہوگی۔ اُسے یہ کام کرنا ہی پڑے گا۔ شام کی نئی حکومت کو عالمی سطح پر شناخت اور قبولیت کے مرحلے سے گزرنا ہے اور اس سلسلے میں امریکا اُس کی بھرپور مدد کرسکتا ہے۔ امریکا کو ٹریک ٹو سفارت کاری کے ذریعے علاقائی اور ملکی سلامتی کے معاملات بہتر بنانے پر خاطر خواہ توجہ دینی ہی پڑے گی۔ امریکا کو شام میں اپنے اتحادیوں اور کردوں سے مل کر اور ترکی کو بھی ساتھ ملا کر کام کرنا چاہیے۔ نئی حکومت پر زور دینا چاہیے کہ وہ کردوں کو نہ چھیڑے اور ملک کو مجموعی طور پر پُرامن رہنے دے۔ امریکا کو شام سے اپنے فوجی بھی فوری طور پر واپس نہیں بلانے چاہئیں۔ جب تک کرد مسئلے کا کوئی معقول حل تلاش نہیں کرلیا جاتا تب تک امریکا کو وہاں سے ہٹنے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیے۔

امریکا کو شام کی آئل فیلڈز بھی نئی حکومت کے حوالے کرنے کا وعدہ کرنا چاہیے۔ اس کے نتیجے میں نئی شامی حکومت کو امریکا کے ساتھ مل کر چلنے اور کام کرنے کی حقیقی تحریک ملے گی۔ یوں کردوں کو ساتھ ملانے کا موقع بھی ملے گی اور اُن میں بھی نئی حکومت پر اعتماد بڑھے گا۔

اقتصادی پابندیوں کا خاتمہ

امریکا کو ایک طرف تو ۲۰۱۲ء سے نافذ اقتصادی پابندیاں اٹھانی چاہئیں اور دوسری طرف شام کے لیے خصوصی امدادی پیکیج کا اعلان کرنا چاہیے۔ بشارالاسد انتظامیہ نے شام کے قومی خزانے سے جو فنڈز چرائے ہیں، اُن کی واپسی کی راہ بھی ہموار کی جانی چاہیے۔ عام شامی باشندوں کی زندگی میں صرف دُکھ ہی دُکھ ہیں۔ اُن کا بھی حق ہے کہ اچھی زندگی بسر کریں۔ اُن کا معیارِ زندگی بلند کرنے پر امریکا خصوصی توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ معیشت مستحکم ہوگی تو ایسا ہوسکے گا۔ شامی معیشت کو سہارا چاہیے۔

شام کے لوگوں کو نئے ہنر سیکھنے کے لیے خصوصی تعاون درکار ہے۔ امریکا کو جدید ترین علوم و فنون میں سُوجھ بُوجھ اور مہارت بڑھانے کے حوالے سے شام کی مدد کرنی چاہیے۔ شام میں میڈیا کے اداروں کو پروان چڑھانے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سول سوسائٹی کے اداروں اور جمہوری اداروں کو بھی پروان چڑھانا ہوگا۔ یہ سب کچھ اُسی وقت ممکن ہے، جب امریکا شام کی بھرپور مدد کرنے کے حوالے سے سنجیدہ ہو۔

یہ تین اور دیگر اقدامات کے ذریعے امریکا شام کی نئی حکومت اور عوام دونوں کو یہ پیغام دے سکتا ہے کہ اُن کی نئی زندگی میں امریکا اُن کے ساتھ ہے، اُن کی طرف دستِ تعاون دراز کر رہا ہے اور مل کر چلنے کے لیے بھی تیار ہے۔ شام کے لوگوں میں جمہوریت کے لیے حقیقی لگن اور تڑپ پیدا کرنا امریکا کا کام ہے۔ علاقائی سلامتی اور استحکام کے حوالے سے شام کے لوگوں کے دلوں میں جتنے بھی خدشات پائے جاتے ہیں، اُنہیں دور کرنے کی ضرورت ہے۔

ٹرمپ کا طریقِ فکر و عمل

دوسری بار امریکا کا صدر منتخب ہونے والے ڈونلڈ ٹرمپ کہہ چکے ہیں کہ جو کچھ بھی شام میں ہوا ہے، اُس سے امریکا کا کوئی تعلق نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکا کا اس پورے معاملے سے بہت گہرا تعلق ہے۔ امریکا اِس وقت شام کو نظر انداز کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ خطے میں اپنا اثر و رسوخ بنائے رکھے تو لازم ہے کہ شام کو ترجیحات میں سرِفہرست رکھے۔ امریکا کو اس حوالے سے بیدار مغزی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ جو کچھ شام میں ہوا ہے، اُسے دیکھتے ہوئے گزر جانا امریکا کے لیے معقول ہے نہ سُود مند۔

جو کچھ اس وقت سوچا جارہا ہے، اُس سے یکسر قطعِ نظر حقیقت یہ ہے کہ شام میں مداخلت نہ کرنے کا ڈونلڈ ٹرمپ کا رویہ کسی بھی اعتبار سے امریکا کے حق میں نہیں۔ عدم مداخلت سے امریکا کو صرف نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اگر امریکا نے اس پورے معاملے سے خود کو الگ تھلگ رکھا تو شام کے لوگوں کو دوبارہ ایران، روس اور ترکی کی طرف جھکنے سے روکا نہیں

جاسکے گا۔ اس کے نتیجے میں یہ ملک ایک بار پھر خانہ جنگی کی دلدل میں دھنس سکتا ہے۔ امریکا اتنا بڑا خطرہ مول لینے کی پوزیشن میں نہیں۔ اگر شام میں روس، ایران اور ترکی ایک بار پھر بھرپور طور پر قدم جمانے میں کامیاب ہوگئے تو معاملات گھوم پھر کر پھر خرابی کی ہی طرف جائیں گے۔ یہ سب کچھ امریکا کے مفاد میں بالکل نہ ہوگا۔

اگر شام کے معاملات درست نہ ہوئے تو متاثرین میں اردن پہلے نمبر پر ہوگا جو امریکا کا اتحادی ہے۔ شام کے حالات کی خرابی جاری رہی تو وہاں سے سیاسی پناہ کے لیے نکلنے والوں کی تعداد میں کمی نہیں آئے گی۔ یہ لوگ اردن کا رخ کریں گے۔ ساتھ ہی ساتھ منشیات کی اسمگلنگ بھی ہوگی اور سلامتی کے لیے خطرات بھی بڑھیں گے۔ اگر شام میں انتہا پسندوں کی حکومت قائم ہوئی اور اُنہوں نے اپنے اثر و رسوخ کا دائرہ وسیع کرنے کی کوشش کی تو شاہ عبداللہ کے اقتدار کو خطرات لاحق ہوسکتے ہیں۔ اردن کو پہلے ہی معاشی بحران اور سکیورٹی سے متعلق خطرات کا سامنا ہے۔

خلیجی ریاستیں اور اسرائیل

شام میں اقتدار کے حوالے سے پیدا ہونے والے خلا کے باعث اسرائیل کی سکیورٹی بھی خطرات سے دوچار ہے۔ اگر اُس کی شمالی سرحدوں پر عدمِ استحکام برقرار رہا تو مشکلات بڑھیں گی۔ اسرائیل کے سب سے بڑے پارٹنر کی حیثیت سے امریکا کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔

اسرائیل نے بشار انتظامیہ کے چھوڑے ہوئے دفاعی اثاثوں کو تباہ کرنے کا عمل تیز کردیا ہے۔ چند اعلیٰ دفاعی نظام اقتدار پر قبضہ کرنے والے گروپوں کے ہاتھ لگ سکتے ہیں۔ اگر شام کی نئی صورتحال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے داعش اور دیگر گروپ وہاں سر اٹھانے میں کامیاب رہے تو اسرائیل کے لیے مشکلات بڑھیں گی اور ایسے میں اُس کے لیے دفاعی اقدامات کا دائرہ وسیع کرنا بھی لازم ہوجائے گا۔

خلیجی ریاستوں کو بھی طرح طرح کے خدشات لاحق ہیں۔ وہ اس بات سے ڈر رہی ہیں کہ کہیں شام مکمل ناکام ریاست میں تبدیل نہ ہوجائے۔ اس کے نتیجے میں علاقائی عدم استحکام کا گراف مزید بلند ہوگا۔ شام کے متحارب گروپ اگر دوبارہ میدان میں آگئے تو پورے خطے کی سلامتی داؤ پر لگ جائے گی۔ خلیجی ریاستیں اس بات سے بھی خوفزدہ ہیں کہ کہیں جہادی پھر فعال نہ ہوجائیں۔

شام میں طاقت اور اقتدار کے حوالے سے پیدا ہونے والا خلا ایران اور دیگر علاقائی طاقتوں کے لیے قدرت کا تحفہ ثابت ہوسکتا ہے۔ وہ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شام میں دوبارہ قدم جمانے کی بھرپور کوشش کرسکتی ہیں۔

ٹرمپ کو رائے بدلنا ہوگی!

ڈونلڈ ٹرمپ نے کہہ تو دیا ہے کہ امریکا کہیں بھی مداخلت نہیں کرے گا مگر سچ یہ ہے کہ انہیں اپنی رائے بدلنا ہوگی۔ تنازعات اور مناقشوں سے گھرے ہوئے خطے کے ایک ملک میں پیدا ہونے والا سیاسی اور دفاعی تعطل کسی بھی طور نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں۔ امریکی پالیسی سازوں کو بھی اس حوالے سے سوچنا ہوگا تاکہ وہ معاملات کو امریکا کے حق میں کرنے کے حوالے سے باضابطہ اور جامع حکمتِ عملی ترتیب دیں۔

ڈونلڈ ٹرمپ عدم مداخلت پر مُصر بھی رہے تو امورِ خارجہ سے متعلق اُن کے پالیسی ایڈوائزر بالخصوص نامزد وزیرِ خارجہ مارکو روبیو انہیں رائے بدلنے کی تحریک دے سکتے ہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ امریکا اپنے مفادات کو تحفظ کرنے کا خواہشمند ہے یا نہیں۔ ڈونلڈ ٹرمپ کو ریاستی پالیسی کے تحت اپنی رائے بدلنا پڑے گی۔ پہلے بھی ایسا ہوا تھا۔ ڈونلڈ ٹرمپ نے اپنے پہلے عہدِ صدارت میں بہت سے معاملات پر رائے بدلی تھی کیونکہ سوال امریکی مفادات کا تھا۔ صدر کی کوئی رائے اپنی رائے نہیں ہوتی۔ اُسے پالیسیوں کے تابع رہنا پڑتا ہے۔

ڈونلڈ ٹرمپ کو یہ بات سمجھنا ہوگی کہ شام کو کسی بھی حال میں کسی اور علاقائی یا عالمی طاقت کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ سابق امریکی صدر براک اوباما کے عہدِ صدارت میں ایسا ہوا تھا۔ انہوں نے شام کو اُس کے حال پر چھوڑا تھا جس کے نتیجے میں خرابیاں پیدا ہوئیں اور خطے کی سلامتی داؤ پر لگ گئی۔

یہ بات بہت تیزی سے امریکی قیادت کی سمجھ میں آجانی چاہیے کہ وہ اپنے کسی بھی اتحادی کے حوالے سے ذمہ داریوں سے سبک دوش نہیں ہوسکتی، بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ شام کے لوگوں کی مدد کرنے کے حوالے سے امریکا کے کاندھوں پر اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

امریکا مشرقِ وسطیٰ میں اپنے تزویراتی مفادات سے کسی بھی طور دستبردار نہیں رہ سکتا۔ ڈونلڈ ٹرمپ کو جلد یا بدیر زمینی حقیقت کے مطابق اپنی رائے بدلنا ہی پڑے گی۔ دنیا بھر میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، اُن کے تناظر میں امریکا کے لیے لازم ہے کہ کسی نہ کسی طور اپنی بالادستی برقرار رکھے، اپنے تزویراتی مفات کا تحفظ یقینی بنانے کے لیے متحرک رہے۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"A non-interventionist approach in Syria is extremely dangerous".

("The Globalist". December 20, 2024)

بقیہ: مشرقِ وسطیٰ میں ''قضیۂ کُرد''

امریکا اور مغربی ممالک کے ساتھ اتحاد کا دفاع کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ صرف اسی وجہ سے ترکیہ اور دیگر ممالک کو کردوں کی نسل کشی کا موقع نہیں ملا۔ 'یہ کرد سفارت کاری میں ایک سنگِ میل ہے۔' اس کے بدلے میں کرد جنگجوؤں نے داعش کا قلع قمع کیا۔

ان کا کہنا تھا کہ شمال اور مشرقی شام کی کرد خودمختار انتظامیہ کثیر الجہتی، سیکولر اور جامع حکمرانی کی مثال ہے، جو مختلف کمیونٹیز کے درمیان بقائے باہمی پر مبنی ہے۔

میں نے جب ان سے پوچھا کہ خطے میں رائے بن رہی ہے کہ شام کا فیصلہ شامیوں پر ہی چھوڑا جائے، جبکہ کرد علاقے میں عراق اور دیگر ملکوں کے کرد شہری سرگرم ہیں، تو کوچ کا کہنا تھا کہ وہ کردوں کے درمیان یکجہتی کو ترجیح دیتی ہیں، خواہ وہ کسی بھی حصے میں ہوں۔ یہ مداخلت نہیں بلکہ اجتماعی کرد مفادات کو یقینی بنانا ہے۔

ان کا کہنا تھا کہ شمال مشرقی شام کو کردوں نے صرف اس وجہ سے آزاد کرالیا تھا جب ترکی، ایران، عراق، شام اور جلاوطن کردوں کے درمیان اتحاد ممکن ہوا۔ مگر ان کا کہنا تھا کہ بدقسمتی سے عراقی کردستان کی روایتی کرد جماعتیں مالی مفادات کی وجہ سے ترکیہ کو فائدہ پہنچاتی ہیں۔

ان کا استدلال تھا کہ عراق نے ۲۰۰۳ء سے وفاقی حل کو اپنایا ہے، اور شام میں کرد ۲۰۱۲ء سے ایک خودمختار انتظامیہ قائم کرنے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ یہ ماڈل سرحدوں کو دوبارہ ترتیب دیے بغیر ایران اور ترکیہ میں بھی ایک جامع حکمرانی کا فریم ورک فراہم کرتا ہے۔

ان کا کہنا تھا کہ مغربی حمایت، خاص طور پر امریکا کی مدد کردوں کی بقا کے لیے اہم ہے۔ عراق میں، کردستان ریجنل گورنمنٹ (کے آر جی) کو اندرونی اختلافات پر قابو پانا ہوگا اور بغداد کے ساتھ پائیدار معاہدے کرنے ہوں گے۔ شام میں، کرد خودمختار علاقہ کا مستقبل انقرہ اور دمشق کے ساتھ بات چیت پر منحصر ہے، جس میں امریکا کی ثالثی سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔

مشرقِ وسطیٰ کی بدلتی ریت میں، کردوں کا سفر جاری ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس خطے کا کوئی بھی ملک ان کے لیے کسی علیحدہ ملک کی پرزور مخالفت کرے گا اور ماضی کی طرح ایسی تحریک کو سختی کے ساتھ دبایا جائے گا۔ گو کہ اس وقت عراق کے صدر اور وزیرِ خارجہ، ترکیہ کے نائب صدر اور وزیرِ خارجہ کرد نسل سے ہی تعلق رکھتے ہیں، مگر ایک کرد کارکن کا کہنا تھا کہ وہ اپنے تشخص اور جائز مقام کے حصول تک جدوجہد جاری رکھیں گے۔

(بحوالہ: ''دی وائر اردو ڈاٹ کام''۔ ۱۸ دسمبر ۲۰۲۴ء)

جرمنی معاشی بحران کی زد میں

Anke Hassel

جرمنی کو غیر معمولی معاشی بحران کا سامنا ہے۔ اس کے باوجود حالات اُس نہج پر ہیں جہاں سے وہ استحکام کی طرف بڑھ سکتا ہے۔

جرمنی میں بہت کچھ تبدیل ہو چکا ہے۔ چند ہفتوں کے دوران معمر افراد کو گزرے ہوئے زمانے غیر معمولی شدت سے یاد آ رہے ہیں۔ اُنہیں محسوس ہو رہا ہے کہ جو کچھ وہ محسوس کر رہے ہیں، اُسے وہ پہلے بھی محسوس کر چکے ہیں۔ جرمن معیشت کے بارے میں نئے سِرے سے بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری ہے۔ اس امر کا جائزہ لیا جا رہا ہے کہ جرمنی کاروبار کے نقطۂ نظر سے قابلِ اعتبار مقام ہے یا نہیں۔

گزشتہ احساس کا احساس

بیس سال قبل ریڈ گرین اتحاد کی حکومت کے آخری دنوں کے نزدیک آنے پر جرمنی کو معاشیات کے کمزور اعداد و شمار کا سامنا تھا۔ ریڈ گرین حکومت ایس پی ڈی اور گیرہارڈ شروڈر کے گرد گھومتی تھی۔

بیس سال قبل معیشت کو لاحق کمزوری دراصل ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل میں مشرقی اور مغربی جرمنی کے انضمام پر آنے والے اخراجات کے باعث تھی۔ ساتھ ہی ساتھ ملینیئم کے ابتدائی دنوں میں نئی معیشت کی اسٹاک مارکیٹ کا مختصر میعاد کا عروج ختم ہو چلا تھا۔ تب جرمنی یورپ کا مردِ بیمار تھا مگر اب؟

۱۹۹۸ء سے ۲۰۰۵ء کے دوران جرمن معیشت صرف ۰٫۲ فیصد سالانہ کی شرح سے پروان چڑھی۔ بے روزگاری ۱۰ فیصد تک جا پہنچی۔ جرمنی میں بجٹ خسارہ یورپی یونین کے اسٹیبلٹی اینڈ گروتھ پیکٹ کے تقاضوں کے منافی تھا۔ تب کسی کو اس بات میں ذرا بھی شبہ نہ تھا کہ جرمنی یورپ کا مردِ بیمار ہے۔

آج جرمن معیشت ایک بار پھر بحرانی کیفیت کے نرغے میں ہے۔ ۲۰۱۹ء سے ۲۰۲۴ء کی درمیانی مدت میں جرمن معیشت کی شرحِ نمو ایک فیصد سے بھی کم رہی۔ اس کے مقابلے میں امریکا میں مجموعی معاشی نمو ۱۰ فیصد تک رہی۔

جرمنی معیشت کو بہت سے معاملات میں مشکلات کا سامنا ہے۔ ایک طرف تو توانائی کے نرخ بہت بلند ہو چکے ہیں۔ دوسری طرف امریکا اور چین کی طرف سے جرمنی کو تجارتی معاملات میں غیر معمولی مسابقت کا سامنا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ۱۶ برس کے دوران اینگلا مرکل کی سربراہی میں قائم ہونے والی حکومتوں نے جرمنی معیشت کی مشکلات میں اسٹرکچرل پیچیدگیوں کے ذریعے اضافہ کیا۔

سرمایہ کاری میں توسیع کی ضرورت

جرمن حکومت نے اکتوبر میں بڑے اور درمیانے حجم کے کاروباری اداروں کے ساتھ دو سربراہ کانفرنسیں منعقد کیں۔ ان کانفرنسوں کا بنیادی مقصد جرمن معیشت کے لیے نیا وژن تلاش کرنا اور نئے اہداف مقرر کرنا تھا۔ اب توقع کی جا رہی ہے کہ ۲۰۳۰ء کے لیے ایک جامع ایجنڈا سامنے آئے گا۔ سوال یہ ہے کہ وہ ایجنڈا ہوگا کیا۔ یہ ایجنڈا سرمایہ کاری سے متعلق ہو سکتا ہے کیونکہ اس وقت جرمن معیشت کو سب سے زیادہ ضرورت سرمایہ کاری کی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بیوروکریسی میں چھانٹی بھی ہونی ہے اور معیشت کو جدت اور ندرت سے ہمکنار بھی کرنا ہے۔ جرمنی کی مخلوط حکومتیں معاشی ایجنڈے کی بنیاد پر قائم ہوتی رہی ہیں۔ اب بھی بنیادی تصور یہ ہے کہ جو بھی مخلوط حکومت معرضِ وجود میں آئے، وہ صرف معیشت پر متوجہ رہے۔

وسیع تر اصلاحی اتحاد؟

اس وقت جرمنی میں عام تاثر اور احساس یہ ہے کہ موجودہ اپوزیشن بھی، جس کے سربراہ فریڈرک مرز ہیں، سرمایہ اور معاشی استحکام سے متعلق کسی بھی جامع اصلاحی ایجنڈے کے خلاف نہیں جائے گی کیونکہ ایسا کرنا عوام کو ناراض کرنے کے مترادف ہوگا۔

سرمایہ کاری کے ایجنڈے پر تمام کاروباری ادارے متحد ہو کر حکومت کے ساتھ کھڑے ہوں گے۔ دی فیڈریشن آف جرمن انڈسٹریز (بی ڈی آئی) نے اندازہ لگایا ہے کہ جرمن معیشت کو نئی زندگی بخشنے اور استحکام سے ہمکنار کرنے کے لیے ۱۰ برس میں ۴۰۰ ارب یورو درکار ہوں گے۔ اب سوال اِتنے سرمائے کے حصول کا ہے۔ سرکاری اور نجی ذرائع سے اتنا سرمایہ جمع کرنا ایک بڑا کام ہے جس کے لیے بہت محنت کرنا پڑے گی۔

نتائج پر مبنی اصولوں کی طرف سفر

جرمنی میں بیوروکریسی پیچیدہ بھی ہے اور وسیع بھی۔ اس کے نتیجے میں معیشت پر اخراجات کا بوجھ بھی بڑھ رہا ہے اور کارکردگی بھی وہ نہیں جو ہونی چاہیے۔ بیوروکریسی کے بکھیڑوں میں الجھنے سے بہت سے کاروباری فیصلے بروقت نہیں ہو پاتے، بہت سے سہولتیں معقول حد تک نہیں مل پاتیں اور اس کے نتیجے میں مسائل بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ بیوروکریسی کا بوجھ گھٹانے سے متعلق اب تک زبانی جمع خرچ ہی ہوتا رہا ہے۔ اس مسئلے کو پوری توجہ سے شناخت کر کے جلد از جلد حل کرنے کی ضرورت ہے۔ جرمن وزیرِ معاشیات رابرٹ ہیبیک کہتے ہیں کہ سپلائی لائن لا کو فوری طور پر ختم کرنے کی کچھ خاص ضرورت نہیں۔

اس وقت جرمن معیشت رپورٹنگ اصولوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ سپلائرز کے معائنے بہت بڑھ گئے ہیں۔ قوانین میں لچک نہ ہونے سے معاملات الجھے ہوئے ہیں۔ سوال اصولوں کا نہیں، نتائج کا ہے۔ کوئی بھی حکومت جو کچھ بھی کرتی ہے، اُس کے نتیجے میں نتائج دکھائی دینے چاہئیں۔ سپلائرز معائنوں پر مبنی رپورٹ تنِ تنہا پوری سپلائی چین کو تبدیل نہیں کر سکتی۔

پیپر ورک میں الجھنے کے بجائے کاروباری اداروں کو سپلائی چین میں اصلاحات کے حوالے سے زیادہ سرمایہ کاری کرنی چاہیے۔ کاروباری اداروں کا یہ شِکوہ بجا ہے کہ اُن کا اچھا خاصا وقت تو بہت زیادہ رپورٹنگ میں ضائع ہو جاتا ہے۔

بیوروکریسی اور معاشرہ

جب میری بیٹی بے روزگار ہوئی تو اُس نے بے روزگاری کے دوران حکومت کی طرف سے دی جانے والی امداد کے حصول کے لیے درخواست دی۔ اُس کے لیے لازم تھا کہ اپنے سابق آجروں کی طرف کی جانے والی ادائیگیوں کا سرٹیفکیٹ پیش کرے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے جو فارم جمع کرانا تھا وہ ۱۰۰ سوالوں پر مشتمل تھا۔

جب ایک بڑے ادارے نے ایسے کسی بھی سرٹیفکیٹ کے اجرا کے حوالے سے بروقت جواب نہیں دیا تو ایمپلائمنٹ ایجنسی نے میری بیٹی سے کہا کہ تعاون نہ کرنے کی صورت میں بیروزگاری الاؤنس سے متعلق اُس کی درخواست مسترد کی جا سکتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایمپلائمنٹ ایجنسی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ میری بیٹی کی تنخواہ کیا تھی اور اُس کے سابق امریکی آجر کی طرف سے کوئی ثبوت فراہم نہ کیے جانے پر بھی حساب لگایا جا سکتا تھا کہ میری بیٹی کو کس حد تک بے روزگاری الاؤنس ملنا چاہیے۔

بیوروکریسی اور اہلِ علم، پروفیشنل

ایک اور مثال۔ میں خود بھی مختلف منصوبوں پر کام کے دوران کئی فارم پُر کرتی رہتی ہوں جبکہ اس کا میرے کام سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ یونیورسٹی میں کئی لوگوں کو اس حوالے سے ذمہ داری سونپنی پڑتی ہے۔

////// باقی صفحہ نمبر ۱۵ \\\\\\

بنگلادیش: طلبہ انقلاب اور شیخ حسینہ کے ظالمانہ اقتدار کا خاتمہ

محمد نصیر الدین

بنگلادیش ۱۶؍دسمبر ۱۹۷۱ء کو ایک خونی جدوجہد کے ذریعے وجود میں آیا تھا۔ نفرت کی بنیاد پر مشرقی پاکستان کی عوام کو پاکستان کے خلاف منظم کیا گیا تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی 'را' کی پشت پناہی سے یہ کام شروع ہوا تھا۔ عوامی لیگ، شیخ مجیب الرحمٰن اور بھارت نے مل کر پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا کیا اور مشرقی پاکستان کے عوام کو ورغلانے میں کامیاب ہوگئے۔ مشرقی پاکستان کے میر جعفر شیخ مجیب الرحمٰن کی رہنمائی میں یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر بھارت فوجی مداخلت نہ کرتا تو پاکستان کا ٹوٹنا ناممکن تھا۔

پاکستان کو بچانے کے لیے حکومت پاکستان کے اقدامات ناکافی ثابت ہوئے اور ہر محاذ پر پاکستان کو شکست ہوئی۔ فوجی محاذ پر شکست کی وجہ حکمت عملی کی ناکامی تھی۔

۱۶؍دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہتھیار ڈالنے کے فیصلے کے بعد بھی پاکستانی فوجیوں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ ۱۶؍دسمبر کے عینی شاہدین اس بات کے گواہ ہیں کہ اس دن پاکستان آرمی کے جذبات کیا تھے؟ وہ خون کا آخری قطرہ تک ملک کے دفاع کے لیے بہانے کو تیار تھے۔ بھارتی قید میں بھی پاکستانی فوجیوں کے حوصلے قابل دید تھے۔ چونکہ وہ اپنے کمانڈر کے فیصلے کے تابع تھے، اس لیے انہوں نے حکم کی پیروی کرتے ہوئے ہتھیار ڈالے تھے۔

صدیق سالک کی کتاب ''میں نے ڈھاکا ڈوبتے دیکھا'' میں اس کی خوب صورت منظر کشی کی گئی ہے۔ میری کتاب ''سقوط ڈھاکا کی حقیقت'' میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔

انگریز ۱۶۰۰ء میں برصغیر میں تجارت کی غرض سے آئے تھے۔ ۱۶۰۲ء میں ڈچ اور ۱۶۰۴ء میں فرانس اور ۱۶۳۳ء میں اسپین، ۱۷۳۳ء میں آسٹریا، ۱۷۳۱ء میں سویڈن تجارت کے نام پر بحری جہاز کے ذریعے برصغیر میں داخل ہوئے۔ ۱۶۲۰ء میں انگریز نے سورت (Surat) کے مقام پر بہت بڑا تجارتی مرکز قائم کیا۔ ۱۶۵۱ء میں انگریز نے بنگلا بہار اڑیسہ میں بھی تجارتی مراکز قائم کیے۔ دراصل یہ مراکز قلعہ نما تھے۔ ان کے تمام مراکز میں ملازمین ہندو تھے۔ ہندو انگریز گٹھ جوڑ اس وقت سے شروع ہوکر مسلمانوں کا پیچھا کرتا رہا اور اس طرح ان کا تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ ہر سطح پر ہندوؤں نے انگریزوں سے ذاتی دوستی قائم کی اور مراعات حاصل کیں۔

جنگ پلاسی میں جب مسلمانوں کو شکست ہوئی اور لارڈ کلائیو نے فتح حاصل کی تو اس وقت ہندوؤں کی طرف سے انہیں بڑا استقبالیہ دیا گیا تھا۔ لارڈ کلائیو عیسائی تھا اور ہندو مذہب سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ہندو اسے خوش کرنے کے لیے Wine، Women اور Welth اس کے سامنے پیش کرتے رہے۔ ان کی یہ دوستی ۱۹۴۷ء میں بھی کام آئی اور انگریزوں نے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مسلم اکثریتی علاقہ بھی ہندوؤں کے حوالے کردیا۔ پنجاب کو تقسیم کرتے ہوئے نہری نظام بھارت کے حوالے کیا گیا۔ اسی طرح بنگلا، بہار اور اڑیسہ کو بھی ہندوؤں کے حوالے کردیا گیا حالانکہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ان کا خیال تھا کہ محمد علی جناح اس تقسیم سے دلبرداشتہ ہوجائیں گے، لیکن قائداعظم نے ہمت نہ ہاری اور مسلمانوں کا علیحدہ وطن بنانے کے لیے جدوجہد جاری رکھی۔

بنگلا اور پنجاب کی تقسیم کے مسئلے پر مسلمان رہنما بہت زیادہ پریشان تھے۔ ہندو انگریز گٹھ جوڑ کے ذریعے مسلمانوں پر زیادتی ناقابل برداشت تھی، لیکن مسلمان رہنماؤں نے بار بار مطالبہ کیا کہ بنگلا، بہار اور اڑیسہ مسلم اکثریتی علاقے ہیں۔ انہیں پاکستان میں شامل ہونا چاہیے، کھلنا بھی اس میں شامل تھا۔ مسلم رہنماؤں کا مزید مطالبہ تھا کہ کلکتہ جو مسلم اکثریتی علاقہ ہے اسے ہر حال میں مشرقی پاکستان کا حصہ ہونا چاہیے کیونکہ کلکتہ میں پٹ سن کی ساری انڈسٹری تھی۔ مسلم رہنماؤں کو خدشہ تھا کہ جس طریقے سے بنگال کو کانٹ چھانٹ کے تقسیم کیا جارہا ہے اس کے نتیجے میں پاکستان کا علاقہ شروع سے ہی معاشی بدحالی کا شکار ہوجائے گا بلکہ معاشی طور پر بالکل اپاہج ہوجائے گا۔ ہندوؤں نے اور بھی بہت سے ہتھکنڈے استعمال کیے۔ بالآخر پنجاب کے ایک حصے کو لے کر مغربی پاکستان اور بنگال کے ایک حصے کو لے کر مشرقی پاکستان وجود میں آیا۔ ڈھاکا کو مشرقی پاکستان کا دارالخلافہ بنایا گیا اور اسی طرح ۱۹۰؍سال کی جدوجہد کے بعد مسلمانوں نے آزادی حاصل کی۔

ہندوؤں نے برصغیر میں مسلمانوں کے علیحدہ وطن کی مخالفت کی تھی۔ ان کے خیال کے مطابق پاکستان ٹوٹ جائے گا اور بھارت دوبارہ سے ایک ہوجائے گا۔ ۱۹۴۷ء میں بھارت کے یوم آزادی کے موقع پر انڈین کانگریس کے صدر جے بی کری پلانی (J.B.Kriplani) نے ہندوستان کی تقسیم کو نہ ماننے اور بھارت کو دوبارہ اکھنڈ بھارت بنانے کا اعلان کیا تھا۔ پنڈت نہرو نے بھی انہی خیالات کا اظہار کیا تھا۔ پاکستان کو نہ اپنے حصے کی پوری زمین ملی، نہ دفاعی سازو سامان، نہ نقد رقم، نہ پنجاب کا نہری نظام اور نہ ہی کلکتہ کا صنعتی علاقہ مل سکا۔ اس طرح شروع سے ہی پاکستان کو دباؤ میں لانے کی کوشش کی گئی۔ ہندوؤں کا خیال تھا کہ اس دباؤ کے نتیجے میں پاکستان کو نقصان پہنچایا جاسکتا ہے۔ لیکن مسلم رہنماؤں نے ہمت نہ ہاری۔ صفر سے انہوں نے کام کا آغاز کیا۔ اپنا نیا سفر ایک نئے جذبے اور امنگ کے ساتھ شروع کیا اور پاکستان کی تعمیر نو میں لگ گئے۔

دفتروں، کچہریوں، عدالتوں اور پارلیمنٹ کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ بیٹھنے کے لیے کوئی کرسی یا میز نہ تھی۔ دو کاغذوں کو جوڑنے کے لیے کوئی کامن پن بھی نہ تھی۔ روڈ انفراسٹرکچر نہ تھا۔ کوئی تعلیمی ادارہ نہ تھا، کوئی فیکٹری نہ تھی۔ کوئی پولیس کا دفتری عملہ اور کوئی ملٹری نہ تھی۔ لیکن لوگوں کے دل میں ایک عزم تھا کہ پاکستان کو دنیا میں سربلند کرنا ہے۔ یہ خواب دل میں لے کر برصغیر کے مسلمانوں نے جدوجہد کی تھی۔ آج وہ خواب شرمندہ تعبیر تھا۔ ۱۴؍اگست ۱۹۴۷ء کی صبح ڈھاکا کے لال باغ میں خواجہ ناظم الدین نے پاکستان کا جھنڈا بلند کیا تھا۔ اس وقت پاکستان کا کوئی قومی جھنڈا نہیں تھا۔ مسلم لیگ کے جھنڈے کو پاکستان کے قومی جھنڈے کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔

ریڈیو ہندوستان کی جگہ ریڈیو پاکستان، پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس کے نام سے وجود میں آچکا تھا۔ قائداعظم کے ریڈیو پاکستان میں خطاب سے پہلے اناؤنسر نے یہ اعلان کیا کہ یہ ریڈیو پاکستان ہے تو سننے والے تمام مسلمانوں نے سجدہ شکر ادا کیا۔ جس کے بعد قائداعظم محمد علی جناح نے خطاب کیا۔ لوگوں کو انہوں نے نیا ولولہ دیا۔ کاش ہم مشرقی پاکستان جو اَب بنگلا دیش ہے اور مغربی پاکستان کی نئی نسل کو آگاہ کرتے کہ کن مشکلات سے پاکستان وجود میں آیا اور کن مسائل کا سامنا کرتے ہوئے پاکستان نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔

جب عوامی لیگ کی طرف سے ۱۹۷۰ء میں پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا کیا گیا تھا، اس وقت مشرقی پاکستان بہت ترقی کرچکا تھا۔ صفر سے شروع کرکے دنیا کے ملکوں میں ایک باوقار مقام حاصل کرچکا تھا۔ ۱۹۷۰ء تک مشرقی پاکستان میں جو ترقی ہوئی عوامی لیگ نے اس کا کبھی تذکرہ نہیں کیا۔ جگہ جگہ اسکول، کالج اور انڈسٹریز بنائی گئیں۔ مساجد اور مدارس تعمیر ہوئے۔ کام کے لیے دفتر تعمیر ہوئے۔ فوج اور پولیس کا ادارہ

بنا۔ نئی انتظامیہ وجود میں آئی۔ کیڈٹ کالجز، زرعی یونیورسٹیز اور میڈیکل کالجز تعمیر ہوئے اور بھی بے شمار ترقیاتی کام ہوئے۔ جس کا عوامی لیگ نے کبھی تذکرہ نہیں کیا۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کی درسی کتب میں کسی بھی کلاس میں یا کسی بھی سطح پر کورس میں ایسا کچھ نہیں لکھا تھا کہ پاکستان کیسے وجود میں آیا اور بعد میں پاکستان نے کیا کچھ بنایا بلکہ ایک منفی اور بے بنیاد پروپیگنڈے کے ذریعے پاکستان کو نقصان پہنچایا گیا۔ شیخ مجیب نے اپنے زور خطابت میں جھوٹ کا سہارا لے کر نوجوانوں کو متاثر کیا اور انہوں نے حکمرانوں پر الزام لگایا کہ وہ سب کچھ مشرقی پاکستان سے اٹھا کر مغربی پاکستان لے گئے ہیں۔ مغربی پاکستان کو سرسبز کرنے کے لیے مشرقی پاکستان کی مٹی بھی اٹھا کر لے گئے ہیں۔ اسلام آباد کی تعمیر کے لیے پٹ سن کی آمدنی کا استعمال کیا گیا ہے اور شیخ مجیب کے مطابق اسے اسلام آباد کی سڑکوں سے پٹ سن کی بو آتی تھی۔ اس پروپیگنڈے کے بعد بھی پاکستان کو دولخت کرنا ممکن نہ تھا اگر بھارت سازش کر کے فوجی مداخلت نہ کرتا۔

۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان بنگلا دیش کی صورت میں علیحدہ ہو چکا تھا۔ شیخ مجیب پاکستان سے رہا ہو کر ڈھاکا کے ریس کورس میدان میں بنگلا دیشی عوام کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ وہ کافی دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ پاکستان کے خلاف لگائے گئے جھوٹے الزامات اسے اندر سے جھنجھوڑ رہے تھے۔ پاکستان کے خلاف اس نے کیا کیا مکاری اور غداری کی، اسے سب یاد آ رہا تھا۔ اب بنگلا دیش بن چکا تھا اور عوام کو کہنے اور کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی منصوبہ نہ تھا۔

شیخ مجیب کا دور اقتدار شروع ہو چکا تھا۔ بدانتظامی، اقربا پروری، بددیانتی اور بدانتظامی کا وہ شکار تھا۔ بنگلا دیش کے عوام اور مکتی باہنی کے کمانڈوز نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ بنگلا دیش کو بھارت کس طرح لوٹ رہا ہے اور سارا ساز و سامان کس طرح وہ بھارت لے کر جا رہے تھے۔ ہزار ہزار گاڑیوں کا قافلہ لدے ہوئے ٹرکوں سمیت بھارت جا رہا تھا۔ چین کی مدد سے بنی ہوئی اسلحہ ساز فیکٹری بھی وہ بھارت اٹھا کر لے گئے۔ یہ سب کچھ بھارتی فوجیوں کی قیادت میں ہر ضلع میں ہوتا رہا جو مکتی باہنی کے گیارہ سیکٹر کمانڈرز کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ انہوں نے مخالفت کی، مزاحمت کی، مجیب سے ملاقات کی اور اس تمام لاقانونیت اور بدانتظامی کی شیخ مجیب سے وضاحت طلب کی۔ ۱۹۷۴ء میں قحط سالی نے عوامی لیگ اور مجیب کی حکومت کی بدانتظامی کو بے نقاب کر دیا۔

قحط سالی میں لاکھوں لوگوں نے بھوک اور افلاس کی وجہ سے اپنی جانیں گنوائیں۔ جس کی وجہ سے لوگوں میں غصہ اور نفرت عروج پر تھی۔ اور فوج کے فریڈم فائیٹرز کے ہاتھوں شیخ مجیب قتل ہوئے۔ (مارنے والے سب فوجی آفیسرز تھے۔) مجیب الرحمٰن کا قتل ایک داستانِ عبرت ہے۔

شیخ مجیب الرحمٰن کی بیٹی شیخ حسینہ واجد بھی اقتدار میں آ کر اپنے والد کے نقش قدم پر چلی اور اپنے باپ کے نامکمل ایجنڈے کی تکمیل میں لگ گئی۔ ظلم و جبر میں وہ اپنے والد سے بھی آگے نکل گئی۔ وہ بنگلا دیشی عوام سے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔ لیکن قدرت نے اسے مزید مہلت نہ دی اور بالآخر وہ بھی اللہ کی گرفت میں آئی اور ملک چھوڑ کر بھارت میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئی۔

شیخ حسینہ واجد کا دور حکومت!

شیخ مجیب الرحمٰن کی بیٹی ۲۳ جون ۱۹۹۶ء میں بنگلا دیش کی وزیراعظم منتخب ہوئیں۔ اس کے بعد وہ ۶ جنوری ۲۰۰۹ء کو دوبارہ وزیراعظم بنگلا دیش منتخب ہوئیں۔ ان کی حکومت کا دورانیہ ۵/اکتوبر ۲۰۲۴ء تک قائم رہا۔ ایک بھرپور اور پرتشدد مظاہرے کے ذریعے حسینہ واجد کی حکومت کا بالآخر خاتمہ ہوا۔ اس مظاہرے میں ایک ہزار سے زائد لوگ جن میں زیادہ تعداد نوجوان لڑکوں کی ہے، جاں بحق ہوئے اور ۲۰ ہزار سے زیادہ لوگ زخمی ہوئے۔ ۲۰۰ کے قریب ایسے نوجوان بھی ہیں جو آنکھوں کی بینائی سے محروم ہوگئے۔ حسینہ واجد اتنا ظلم کرنے کے باوجود عوامی نفرت کے سامنے ٹھہر نہ سکیں۔ ۵/اکتوبر ۲۰۲۴ء کو کروڑوں بنگلا دیشی عوام سڑکوں پر مارچ کر رہے تھے۔ جن میں طلبہ، خواتین اور بچے بھی شامل تھے۔ ڈھاکا شہر میں گویا لوگوں کا ایک سمندر تھا جو امڈ آیا تھا۔ سب کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا ''گو حسینہ گو'' سیکورٹی فورسز عوام کے سامنے بالکل بے بس تھیں اور عوام کا سمندر وزیراعظم ہاؤس کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ موت شیخ حسینہ واجد کا پیچھا کر رہی تھی۔ پھر سیکورٹی فورسز نے حسینہ کو ۴۵ منٹ کا وقت دیا کہ اگر جان بچانا ہے تو یہاں سے چلی جائے اور اس طرح حسینہ اپنے پڑوسی اور دوست ملک بھارت فرار ہوگئی۔ بنگلا دیش کے عوام نے سکھ کا سانس لیا اور آزادی کا جشن مناتے رہے۔

بنگلا دیش کے طلبہ اور عوام کی اس مشترکہ جدوجہد نے دنیا کے سامنے ثابت کیا کہ بنگلا دیش کے لوگ بھارت سے کتنی زیادہ نفرت کرتے ہیں۔ سڑکوں پر سب انقلابی یہ نعرہ بھی لگا رہے تھے کہ بھارت کا جو دوست ہے وہ بھارت واپس چلا جائے۔

بنگلا دیش کے عوام نے اس عظیم الشان مظاہرے کے ذریعے دنیا کی غلط فہمی کو دور کر دیا کہ وہ بھارتی تسلط کو برداشت کر لیں گے۔ جو سپر پاور یا حکومتیں بنگلا دیش کو بھارت کے ذریعے کنٹرول کرنے کی خواہاں تھیں ان کی غلط فہمی دور ہوگئی۔ بنگلا دیش کے عوام نے بھارت سے ۱۹۷۱ء کا بدلہ لے لیا اور اس بات کا اعلان کیا کہ وہ مسلم دنیا کے ساتھ ہے اور اس کا ایک حصہ ہے۔

پاکستان کو توڑنے والوں میں ایک نمایاں کردار ادا کرنے والے شیخ مجیب الرحمٰن کی بیٹی کا انجام بالآخر عبرت ناک ہوا۔ یہ سب کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ پاکستان کو توڑنے والے تمام کرداروں کا انجام ایسا ہی ہوا۔ ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل امجد شعیب نے اپنے پروگرام D.D.P.Analytica ڈی پی پی اینالیٹکا میں پاکستان توڑنے والے کرداروں کی نشاندہی کی ہے۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ اس کی پکڑ سے کوئی بچ نہیں سکا۔ اِن بطش ربک لشدید.

شیخ حسینہ واجد بنگلا دیش میں نفرت کی سیاست کو کم کر سکتی تھی۔ بدلہ لینے کے رجحان کو ختم کر کے سیاست میں صبر اور برداشت سے کام لیتے ہوئے میرٹ پر کام کرتی تو یہ صورتِ حال نہ ہوتی۔ اس طرح وہ ایک اسلامی فلاحی معاشرے کی بنیاد رکھ سکتی تھی۔ لیکن اس نے ایسا کچھ نہ کیا۔ وہ اور اس کا پورا خاندان بدلہ لینے کی سیاست اور نفرت کی آگ میں جھلس کر رہ گیا۔ حسینہ واجد اپنے باپ کے قتل اور اس کے انجام سے عبرت حاصل کرنے کی بجائے اسی نفرت کی سیاست میں کود پڑی۔ اور بدلہ لینے کے لیے اقتدار کی کرسی پر براجمان ہوئی اور پرتشدد حکمرانی کا آغاز کیا۔

حسینہ واجد کی حکومت سے پہلے جب ضیاالرحمٰن برسر اقتدار آئے تو انہوں نے مجیب کے قاتلوں کو معاف کر دیا تھا۔ ضیا الرحمٰن کی کوشش تھی کہ سیاست میں شائستگی اور برداشت کو اپنایا جائے اور بنگلا دیش کو ایک فلاحی ریاست بنایا جائے۔ ان کی کوششوں سے ملک میں سیاسی بحران پر قابو پا لیا گیا تھا۔ مجیب کے دور میں اسمگلنگ، اقربا پروری اور کرپشن کی وجہ سے ملک تباہی کے دہانے پر پہنچ چکا تھا، قحط کا آغاز ہو چکا تھا۔ بھوک اور افلاس سے مرنے والوں کی لاشیں سڑکوں پر پڑی ہوئی تھیں۔ گدھ ان لاشوں کو نوچ رہے تھے۔ لوگوں نے درختوں کے پتے کھا کھا کر ختم کر دیے تھے۔ مجیب کی وفات کے بعد خندہ کار مشتاق احمد اور ضیا الرحمٰن کی پالیسیز کے نتیجے میں اسمگلنگ کے خاتمے کی صورت میں ملک میں معاشی حالات بہتر ہونا شروع ہوگئے تھے۔ اس پالیسی کے نتیجے میں اقربا پروری کی بجائے میرٹ پر بھرتیاں ہونا شروع ہو چکی تھیں اور ملک ترقی کی جانب گامزن ہو چکا تھا۔ یہی اقدامات ضیا الرحمٰن کے قتل

کی وجہ بنے۔ بھارت اور بنگلا دیش میں موجود ان کے حواریوں کے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ ملک آزاد معاشی اور خارجہ پالیسی پر عمل کر کے ترقی کی جانب گامزن ہو۔ چنانچہ ضیا الرحمٰن کو چٹاگانگ کے ریسٹ ہاؤس میں قتل کر دیا گیا۔

جب شیخ حسینہ واجد کا دور شروع ہوا تو اس نے ضیا الرحمٰن کی دی ہوئی عام معافی کو ختم کر دیا اور مجیب کے قاتلوں کو سزائے موت دلوائی۔ جو ملک سے باہر تھے انہیں انٹرپول کے ذریعے ملک میں واپس لانے کی کوشش کی گئی۔

پاکستان کا ساتھ دینے کے جرم میں جماعت اسلامی بنگلا دیش کے رہنماؤں کو گرفتار کر کے پابند سلاسل کیا گیا، ان کو نام نہاد عدالت کے ذریعے سزائے موت سنائی گئی اور اس پر عمل درآمد بھی کروایا گیا۔ پوری دنیا نے اس پر احتجاج کیا مگر حسینہ واجد نے کسی کی نہ سنی۔ سزائے موت پانے والوں کے نام درج ذیل ہیں:

۱) مولانا مطیع الرحمٰن نظامی۔
۲) عبدالقادر مُلّا
۳) میر قاسم علی
۴) قمر الزمان
۵) علی احسن محمد مجاہد

جنہیں عمر قید کی سزا دی گئی وہ حسب ذیل ہیں:

۱) پروفیسر غلام اعظم
۲) مولانا دلاور حسین سعیدی
۴) مولانا ابوالکلام یوسف
۵) مولانا عبدالسبحان

سزائے موت پانے والوں میں بی این پی کے رہنما صلاح الدین قادر چودھری بھی شامل تھے۔ وہ متحدہ پاکستان کے قائم مقام صدر اور قومی اسمبلی کے اسپیکر فضل القادر چودھری کے صاحبزادے تھے۔ فضل القادر چودھری کو بھی پاکستان کا ساتھ دینے کے جرم کی پاداش میں عمر قید کی سزا سنائی گئی تھی۔ ان کی وفات جیل میں ہی ہوگئی تھی۔

یہ سب لوگ عوامی رہنما تھے اور ان کے لاکھوں فالورز بنگلا دیش میں موجود تھے۔ ان سب کو سزائے موت دینا اور کچھ کو عمر قید کی سزا سنانا حسینہ واجد کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا۔ مختلف ممالک کے حکمرانوں نے حسینہ واجد کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کا کہا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور یوں اس کا رابطہ مسلم دنیا سے کٹ گیا اب صرف اس کا انحصار بھارتی خفیہ ایجنسی را (RAW) پر ہی رہ گیا۔

ہر قسم کے چھوٹے بڑے دینی اجتماع پر پابندی عائد کر دی گئی تھی اور ان اجتماعات کو پولیس اسٹیشن کی اجازت سے مشروط کر دیا گیا تھا۔ ہزاروں علمائے کرام کو جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ مدارس کے طلبہ پر جہاں موقع ملا وحشیانہ تشدد کیا گیا۔ بہت سارے جید علما کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ ڈاکٹر میزان الرحمٰن اظہری کو مختصر نوٹس پر ملک چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ وہ ملائیشیا میں چار سال سے زیادہ عرصہ تک جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے بعد حسینہ واجد کی حکومت کے خاتمے کے بعد اپنے وطن واپس پہنچے۔ جیل میں وفات پانے والوں میں بنگلا دیش جماعت اسلامی کے مقبول رہنما پروفیسر غلام اعظم صاحب بھی شامل ہیں۔ ان کی نماز جنازہ میں لاکھوں لوگوں نے شرکت کی۔

علامہ دلاور حسین سعیدی قرآنِ مجید کے مفسر تھے اور بہت بڑے عالم دین تھے۔ ان کے بنگلا دیش میں کروڑوں پیروکار موجود تھے جن میں زیادہ تر نوجوان طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ سب لوگ ان کی قرآن کی تعلیمات اور دروس قرآن سے فیض یاب ہوتے تھے۔ انہیں بھی پاکستان کا ساتھ دینے کے جرم میں سزائے موت سنائی گئی۔ جب ان کی سزائے موت کا اعلان ہوا تو لاکھوں طلبہ نے ان کی سزا کے خلاف سڑکوں پر احتجاج کیا۔ پولیس کے تشدد سے ۲۵۰ کے قریب لوگوں نے شہادت پائی۔ عوام کے احتجاج کی وجہ سے ان کی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا۔ جماعت اسلامی کے جتنے رہنماؤں نے سزائے موت یا عمر قید کی سزا پائی یہ سب لوگ عوام میں بہت مقبول اور پسندیدہ تھے۔ ان اقدامات نے عوام کے دل میں حسینہ واجد کے خلاف نفرت کا بیج بو دیا تھا۔

حفاظت اسلام کے مظاہرین پر حکومت کا تشدد

۵ مئی ۲۰۱۳ء کو ڈھاکا کے شپلہ چوک میں مدارس کے لاکھوں طلبہ نے مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اپنے چند جائز مطالبات حکومت کو پیش کرنا چاہتے تھے۔ حکومت نے ان کے جائز مطالبات کو ماننے کی بجائے انہیں تشدد کا نشانہ بنایا۔

پولیس، RAB، بارڈر گارڈ بنگلا دیش کے ذریعے رات کے اڑھائی بجے ان پر چاروں اطراف سے حملہ کر کے وحشیانہ تشدد کیا گیا۔ لائٹس بند کر کے ان پر اندھا دھند گولیاں برسائی گئیں۔ سیکڑوں طلبہ شہید ہوئے، ہزاروں زخمی ہوئے اور ہزاروں کی تعداد میں ہی گرفتار کیے گئے۔ موتی جھیل کا پورا علاقہ خون سے نہلا دیا گیا۔ ہر طرف چیخ و پکار تھی۔ حکومت بنگلا دیش نے ڈھاکا کارپوریشن کے ٹرکوں کے ذریعے لاشوں کو ٹھکانے لگایا اور پورے علاقے کو پانی سے دھو دیا۔ اس پرتشدد واقعے کے نتیجے میں سیکڑوں لوگ ہلاک ہوئے جن کی فہرست ہیومن رائٹس آرگنائزیشن آدھی کار نے شائع کی۔

حفاظت اسلام نے اس فہرست کو مسترد کر دیا اور کہا کہ جاں بحق ہونے والے طلبہ کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ پورے بنگلا دیش میں حفاظت اسلام کے کارکن بہت مشتعل ہو گئے تھے۔ عوامی لیگ کے رہنماؤں اور کارکنان کا گھروں سے نکلنا مشکل ہو گیا تھا اور کچھ گھر سے بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔

حفاظت اسلام کا یہ احتجاج اتنا بھرپور اور پرتشدد تھا کہ حکومت کا خاتمہ ہو سکتا تھا۔ لیکن حسینہ واجد نے معاملات کی سنگینی کو سمجھتے ہوئے حفاظت اسلام کے رہنماؤں سے مذاکرات کے ذریعے معاملہ رفع دفع کیا۔

کچھ ہی عرصہ بعد شیخ حسینہ واجد نے علما پر دوبارہ تشدد کا سلسلہ شروع کیا اور علامہ مامون الحق اور مفتی امیر حمزہ سمیت بہت سے علما کو جیلوں میں نظر بند کیا گیا۔ ان پر تشدد کیا گیا اور انہیں چار سال تک (یعنی حسینہ واجد حکومت کے خاتمے تک) جیل میں پابند سلاسل رکھا گیا۔

B.D.R واقعہ ۲۵ فروری ۲۰۰۹ء

بنگلا دیش رائفلز کو بی ڈی آر کہا جاتا ہے۔ یہ بنگلا دیشی فوج کا ایک حصہ تھے جو بنگلا دیش بارڈر کی حفاظت کرتے تھے۔ ایک منظم منصوبہ بندی کے تحت ان کے ۵۷ آفیسرز کو پل خانہ بی ڈی آر ہیڈ کوارٹر میں بلا کر شہید کر دیا گیا۔ جس میں ان کے کمانڈر میجر جنرل شکیل احمد بھی شامل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ حسینہ حکومت نے راء سے مل کر یہ سارے کام سرانجام دیے تھے۔ ایک منظم منصوبہ بندی کے تحت انہیں اور ان کے اہل خانہ کو اپنے ہیڈ کوارٹر بلا کر باری باری قتل کیا گیا۔ ان کے بچوں تک کو نہ چھوڑا گیا۔ اس سانحے سے بنگلا دیشی فوج میں کہرام برپا ہو گیا۔ کیونکہ فوجی جوان ان کو بچانے کے لیے جانے کو تیار تھے مگر انہیں اجازت نہ دی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ بی ڈی آر کے فوجیوں کو مارنے والے بنگلا دیش کے ایک پڑوسی ملک سے جہاز کے ذریعے آئے تھے اور واردات کر کے چلے گئے۔ یہ سانحہ بنگلا دیش نہیں فوج کے لیے ناقابل فراموش واقعہ ہے۔ بنگلا دیشی فوج کے بہت سارے آفیسرز نے اس سانحہ پر احتجاج کیا۔ حسینہ واجد نے اس پر تحقیقات کروانے کی بجائے ان آفیسرز کو ملازمت سے برطرف کر دیا۔ تمام فوجی آفیسرز کی خصوصی میٹنگ بلا لی گئی جس میں حسینہ واجد بھی مدعو تھیں۔ حسینہ کے آنے سے وہاں بہت شور شرابہ ہوا۔ شیخ حسینہ واجد بڑی مشکل سے جان بچا کر واپس جانے پر مجبور ہوئی۔ یہ واقعہ بنگلا دیشی فوج اور عوام کے لیے ایک ناسور ہے۔ ہر سال ان آفیسروں کے خاندان والے انصاف مانگتے ہیں۔ لیکن آج تک انہیں انصاف نہیں ملا۔ اسی

طرح بی ڈی آر کے ہزاروں فوجی جوانوں پر جھوٹے مقدمات چلائے گئے، سیکڑوں کو سزائے موت دے دی گئی، ہزاروں کو جیلوں میں ڈالا گیا اور ہزاروں کو جبری طور پر ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔

پولیس اور را کے ذریعے بہت سارے فوجی آفیسرز کو اغوا اور قتل کیا گیا۔ اغوا کیے جانے والوں میں نمایاں طور پر پروفیسر غلام اعظم کے بیٹے بریگیڈیئر جنرل امان بھی شامل تھے جو حکومت کے خاتمے کے بعد منظر عام پر آئے۔

انتخابات میں دھاندلی!

شیخ مجیب الرحمٰن کی طرح شیخ حسینہ واجد کو بھی یقین تھا کہ وہ عوام کی اکثریت کھو چکی ہے۔ لہٰذا شفاف انتخابات کے ذریعہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتی۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے ۱۹۷۴ء میں دھاندلی کے ذریعے انتخاب جیتا تھا۔ اس وقت فریڈم فائٹرز کے کمانڈر میجر جلیل نے عوامی لیگ کی بھارت نواز پالیسی کی وجہ سے عوام کو شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف منظم کیا تھا۔ لیکن انتخاب سے پہلے کمانڈر جلیل کو جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس طرح شیخ مجیب انتخاب جیت گیا تھا۔ شیخ حسینہ واجد نے بھی تمام انتخابات را (RAW) کی مدد سے جیتے تھے۔ ۲۰۱۸ء کے انتخابات میں رات کو ہی ووٹ ڈال دیے گئے تھے اور صبح نتائج کا اعلان کر دیا گیا۔

جنوری ۲۰۲۴ء میں صرف عوامی لیگ کو ہی انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت تھی۔ ۲۰۰ کے قریب عوامی لیگ کے نمائندے قومی اسمبلی کے لیے بلا مقابلہ منتخب ہوئے اور باقی نشستوں پر بھی برائے نام مقابلہ تھا۔ مخالف امیدواروں کو انتخاب لڑنے کی اجازت نہیں دی گئی اور نہ ہی عوام میں مخالف ووٹروں نے گھروں سے نکلنا ضروری سمجھا۔ اس طرح حسینہ واجد بہت آسانی سے یہ انتخاب جیت گئی۔

عدالتی نظام

بنگلادیش کے عدالتی نظام کو ختم کر کے رکھ دیا گیا تھا۔ چیف جسٹس سے لے کر سیشن جج تک کسی کو قانون کے مطابق فیصلے کرنے کی اجازت نہ تھی۔ سرکار جتنے دن کا چاہتی تھی ریمانڈ دیتی تھی۔ جج کسی کو بھی اپنی مرضی سے ضمانت نہیں دے سکتے تھے۔ اور اس طرح ہزاروں نہیں لاکھوں مخالفین اور سیاسی کارکنان کو جیلوں میں ڈالا گیا۔ تین چار سال، پانچ پانچ سال تک کسی کی شنوائی نہ ہوئی۔ اسی عدالتی نظام کے ذریعے جماعت اسلامی کے کارکنان کو جیلوں میں ڈالا گیا۔ بنگلادیش کے سابق چیف جسٹس سورندر کمار سہنا ایک ہندو جج تھا۔ اسی کے ذریعے حسینہ واجد نے عدالتی نظام کو حکومت کی مرضی کے مطابق چلایا اور سب سیاسی قیدیوں کو سزائیں دلوائی گئیں۔ کسی کی جرات نہ تھی کہ عوامی لیگ یا پھر حسینہ واجد کی اجازت کے بغیر کوئی فیصلہ دے۔

چیف جسٹس نے کسی ایک کیس میں حسینہ واجد کی مرضی کے خلاف فیصلہ دیا تو نتیجے کے طور پر حسینہ واجد نے اسے وزیراعظم ہاؤس طلب کر لیا۔ ایک اطلاع کے مطابق حسینہ واجد نے اس کی جوتے سے پٹائی کی کہ اس کی مرضی کے بغیر فیصلہ کیوں دیا۔ بات صرف یہاں ختم نہیں ہوتی بلکہ عوامی لیگ اور اسٹوڈنٹ لیگ کے مسلح کارکنان کو اس چیف جسٹس کے آفس بھیج کر اس سے زبردستی استعفیٰ لیا گیا اور اس کو ملک بدر ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔

پروفیسر ڈاکٹر تاج ہاشمی نے اپنے ٹیلی ویژن پروگرام میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر تاج ہاشمی ''ہونولولو'' میں پروفیسر آف سیکورٹی اسٹڈیز ہیں۔ سابق چیف جسٹس نے اپنی کتاب A Broken Dream, Rule of Law Human Rights & Democracy میں حسینہ واجد کے عدالتی نظام میں ظلم و جبر کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس نے عدالتی نظام کو Cripple (لولا لنگڑا) یعنی تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔

حسینہ واجد کی حکومت نے ۲۵۰۰ جید علما کو گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیا تھا۔ ان پر وحشیانہ تشدد کیا جاتا۔ ان کے نازک اعضا پر بجلی کے جھٹکے لگائے جاتے اور انہیں زنجیروں سے جکڑ کر رکھا جاتا تھا۔ سالہا سال انہیں جیلوں میں پڑا رہنے دیا گیا، کوئی شنوائی نہ ہوتی تھی۔

بی این پی کی طرف سے الزام عائد کیا گیا کہ ۲۰۰۹ء سے ۲۰۲۲ء تک ان کے سیکڑوں قائدین اور کارکنان کو موت کی نیند سلا دیا گیا تھا۔ ۶۰۰ کارکنان کو اغوا کر لیا گیا۔ ایک لاکھ پچاس ہزار لوگوں کو جیلوں میں ڈال کر خود ساختہ مقدمات چلائے گئے۔ حسینہ واجد کے اقتدار کے آخری دنوں میں ۲۰ ہزار قائدین اور کارکنان جیل میں تھے۔ جن میں بیگم خالدہ ضیا بھی سرفہرست تھیں۔

جماعت اسلامی کے سیکرٹری اطلاعات کی طرف سے جو بیان جاری کیا گیا اس کے مطابق ۹۱,۲۴۶ کارکنان اور رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا اور ریمانڈ لے کر ان پر تشدد کیا گیا۔ ۵ ہزار سے زائد رہنماؤں اور کارکنان کو مختلف تھانوں میں بند کر کے تشدد کے ذریعے اپاہج بنا دیا گیا۔ جماعت اسلامی چٹا گانگ کے امیر اور سابق ممبر قومی اسمبلی اور سابق ناظم اعلیٰ اسلامی چھاتروشبر (اسلامی جمعیت طلبہ) جناب شاہجہان چودھری نے کہا ہے کہ حسینہ واجد دور میں شبر کے ۷۵۰ رہنماؤں اور کارکنوں کو شہید کیا گیا۔ ان سب کے خون کی ذمہ داری شیخ حسینہ واجد پر ہے۔

حسینہ واجد کے اقدامات سے نمایاں طور پر اسلام کے خلاف کھلم کھلا نفرت کا اظہار ہوتا ہے۔ جس ملک میں ۹۰ فی صد مسلمان بستے ہوں وہاں اسلام کے خلاف اقدامات نے مسلم عوام کے دلوں میں نفرت کو جنم دیا، جو حسینہ واجد کے خلاف مظاہروں میں سب کو نظر آیا۔ بنگلادیش کے مسلمان جن میں لاکھوں مدارس کے طلبہ، مظلوم عوام، جماعت اسلامی کے کارکنان، کالجز اور یونیورسٹیوں کے طلبہ، بی این پی کے کارکنان حسینہ واجد کے اسلام دشمن اقدامات پر بہت دکھی تھے۔ اسی وجہ سے طلبہ کی کال پر سب میدان میں نکل آئے۔ یہ حسینہ حکومت کے اپنے کیے کا ردعمل تھا۔ یہاں تک کہ حسینہ واجد کو حکومت چھوڑ کر ملک سے فرار ہونا پڑا۔

بھارت نواز پالیسی!

شیخ حسینہ واجد سمجھتی تھی کہ بنگلادیش کے لوگوں نے اس کے باپ کے ساتھ وفا نہیں کی۔ اس کے قتل کیے جانے پر کوئی ردعمل ظاہر کرنے کی بجائے لوگوں نے اس کو نجات سمجھا اور ایک دوسرے کو مبارک باد دے کر مٹھائیاں تقسیم کیں۔ اس احساس نے حسینہ واجد کا ہمیشہ پیچھا کیا اور اس نے بنگلادیش کی عوام سے سنگین بدلہ لینے کی ٹھانی۔ ہر سال ۱۵/اگست (مجیب کے قتل کے دن) وہ اس بات کا اظہار کرتی کہ میرے باپ کے قتل پر کسی نے نہیں پوچھا۔ میرے باپ کی لاش اٹھانے کوئی نہ آیا۔ ہر سال شدت سے اس کا اظہار کرتی کہ میرے باپ کا کوئی ایک وفادار بھی نہ تھا۔ اس لیے اس نے اس قوم سے بدلہ لینے کا تہیہ کر لیا اور ملک کو بھارت کے سپرد کر دیا اور بار بار اس بات کا اعلان کیا کہ میں نے بھارت کو جو دیا وہ اس کو کبھی نہیں بھلا سکتے۔

شیخ مجیب الرحمٰن پاکستان سے رہا ہو کر جنوری ۱۹۷۲ء میں بنگلادیش پہنچے اور مارچ کے مہینے میں بھارت کی وزیراعظم اندرا گاندھی بنگلادیش کے دورے پر آئیں اور ۱۹/مارچ کو بنگلادیش بھارت دوستی کے معاہدے پر دستخط کیے۔ اس معاہدے کی وجہ سے بنگلادیش کی آزاد حیثیت اور خودمختاری متاثر ہوئی۔ کیونکہ بنگلادیش کی سکیورٹی، دفاع اور خارجہ بھارت کے حوالے کر دیا گیا تھا اور بنگلادیش کے عوام نے اس معاہدے کو سختی سے مسترد کیا۔

حکومت نے دریائے گنگا کے اوپر فارقہ بند کے ذریعے بنگلادیش کے پانی کو بھی روک لیا۔ اس سے بنگلادیش کے کروڑوں کسان متاثر ہوئے۔ پانی کی عدم دستیابی کی وجہ سے

زمینیں بنجر ہوگئیں۔ فارقہ بند بنگلا دیش کی عوام کے معاشی قتل کا منصوبہ ہے۔ بنگلا دیش کی عوام اس فیصلے سے نفرت کرتے ہیں اور مسترد کرتے ہیں۔

بھارت نے بنگلا دیش کے تین اطراف میں بند باندھ کر دریاؤں اور نہروں کا پانی روک لیا ہے۔ موسم گرما میں پانی کو روکنا اور موسم برسات میں پانی کو چھوڑ کر بنگلا دیش کو سیلاب کے خطرات سے دوچار کرنا اس کا وطیرہ بن گیا ہے۔ بنگلا دیش کے عوام کا اس سے شدید نقصان ہوتا ہے۔

بنگلا دیش بھارت بارڈر پر بھارت کی اجارہ داری ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں بھارتی ٹرک بنگلا دیش میں داخل ہوتے ہیں اور اپنا سامان فروخت کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔ اس سے مقامی کسان اور بنگلا دیش کی معیشت بُری طرح متاثر ہوئی ہے۔ اگر بنگلا دیش کی سکیورٹی فورسز اس کو روکنے کی کوشش بھی کریں تو انہیں گولیوں سے بھون ڈالا جاتا ہے۔ بارڈر پر اس کی اجارہ داری قائم ہے۔ بنگلا دیش اور بھارت بارڈر کا ۴۰۹۶ کلومیٹر کا علاقہ بھارت کے مکمل کنٹرول میں ہے، جب چاہے اس کو کھول دیتا ہے اور جب چاہے بند کر دیتا ہے۔ اس وجہ سے بنگلا دیش کی عوام کے دل میں بھارت سے شدید نفرت پائی جاتی ہے۔

کئی ارب ڈالرز کے (Tista Dame) ٹیسٹا ڈیم پروجیکٹ کو بھارت کے حوالے کر دیا گیا جو بنگلا دیش کے مفاد کے خلاف ہے۔ وہاں کی عوام اس کو سخت ناپسند کرتی ہے۔ بنگلا دیش کی بجلی کی پیداوار اس کی ضرورت سے زیادہ ہے۔ اس کے باوجود بھارت کے اڈانی گروپ سے مہنگے داموں بجلی خریدی جاتی ہے۔ بجلی استعمال ہو یا نہ ہو ہر حال میں بنگلا دیش کو اس کی ادائیگی کرنا ہوتی ہے۔ یہ ۲۵ سالہ معاہدہ ہے جس سے بنگلا دیش کا سالانہ اربوں ڈالر کا نقصان ہو رہا ہے۔ حسینہ واجد اپنے ذاتی مفاد کے لیے اڈانی گروپ کو ادائیگی کرتی رہی ہے۔

بنگلا دیش کے مشہور اکانومسٹ اسدالزمان ریون نے کہا ہے کہ بھارت کو خوش کرنے کے لیے دریائے پدما کے اوپر ریلوے لائن بچھائی گئی ہے۔ اس کی بنگلا دیش کو کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس ریلوے لائن کے ساتھ ۲ سڑکیں بھی بنائی گئیں ہیں۔ یہ بھارت کی ۷ سسٹرز ریاستوں کو راستہ بنا کر دیا گیا ہے۔ یہ کئی ارب ڈالر کا پروجیکٹ ہے۔ اس راستے کے ذریعے ۷ سسٹرز سے آمد و رفت کو بحال کیا گیا ہے۔ بنگلا دیش کے عوام خاص طور پر نوجوان طبقہ بھارت کے ساتھ اس معاہدے کو بڑی نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ورلڈ بینک نے اس پروجیکٹ میں مالی بددیانتی کی وجہ سے مالی تعاون سے انکار کر دیا تھا۔ ایڈ کے نام پر ۷ سسٹرز ریاستوں کے لیے بہت سے راستے بنا کر دیے گئے ہیں۔ ریلوے لائن اور روڈ انفراسٹرکچر کو ترقی دی گئی ہے۔ جس کا ایک ہی مقصد ہے کہ ۷ سسٹرز تک رسائی آسان ہو۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے بھارت نے بنگلا دیش کو کڑی شرائط پر قرضہ دے کر کام مکمل کروایا ہے۔ لوگ اب اس کی چال کو سمجھ چکے تھے۔ ان کا غصہ عروج پر تھا۔ وہ موقع کی تلاش میں تھے اور تحریک میں کود پڑے۔

چٹاگانگ کی بندرگاہ اور منگلہ کی بندرگاہ بھارت کے حوالے کر دی گئی ہے۔ یہ دونوں بندرگاہیں بنگلا دیش کی معاشی شہ رگ ہیں۔ اسی لیے لوگ اس کو بھارت کے کنٹرول میں دینے کے خلاف تھے۔ بھارت کے ساتھ کیے گئے سارے معاہدوں کی تفصیلات سے بنگلا دیش کی عوام کو بے خبر رکھا جاتا ہے۔ بنگلا دیش میں قائم بھارتی سفارت خانے کے مطابق ۲۰۱۰ء سے ۲۰۲۴ء تک بنگلا دیش نے بھارت کے ساتھ ۲۰ معاہدوں پر دستخط کیے ہیں اور ۶۴ ایسے معاہدات ہیں جن پر بنگلا دیش نے حامی بھری ہے۔ بھارتی خفیہ ایجنسی را بنگلا دیش کو آپریٹ کرتی ہے۔ (۔۔۔جاری ہے!)

بقیہ: جرمنی معاشی بحران کی زد میں

بیوروکریسی کے یہ تمام طریقے، جو وقت ضائع کرتے ہیں، اب ختم کیے جانے چاہئیں۔ بیوروکریسی کا حجم معقولیت کی حد تک گھٹانے کے لیے تجاویز مرتب کرنے والوں کی کمی نہیں۔

نظمِ عامہ کی ڈیجیٹائزیشن

عوام کے لیے بیوروکریسی نے بہت سی الجھنیں پیدا کر رکھی ہیں۔ اگر جرمنی کو کاروبار کے لحاظ سے پُرکشش بنانا ہے تو لازم ہے کہ معیشت کو جدت سے ہم کنار کیا جائے۔ اس کے لیے ڈیجیٹائزیشن لازم ہے۔ لوگوں کو فارمز کے بکھیڑوں میں نہ الجھایا جائے۔

فلاحی ریاست کے تصور کو نظمِ عامہ میں شامل کیا جائے۔ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں میسر ہونی چاہئیں۔ ۲۰۲۴ء میں وفاقی بجٹ کے ایک چوتھائی کے برابر رقوم (تقریباً ۱۱۰؍ارب یورو) پنشن انشورنس فنڈ میں چلے گئے۔

۱۹۸۰ء کی دہائی کے آخر میں مشرقی اور مغربی جرمنی کے انضمام سے قبل بجٹ میں پنشن کا شیئر ۱۶؍فیصد سے زیادہ نہ تھا۔ وہ زمانہ اب گزر چکا ہے۔ مشرقی جرمنی کو ترقی اور خوشحالی کے معاملے میں مغربی جرمنی کے مقابل لانے کے لیے بہت کچھ خرچ کرنا لازم تھا مگر اب ایسی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔

جرمنی کو اس وقت پنشن کی مد میں بہت زیادہ ادا کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ سب کچھ انتہائی نوعیت کے معاملے میں تبدیل ہو چکا ہے۔ معیشت کا ایک بڑا حصہ ایسی مد میں خرچ ہو رہا ہے جس سے حاصل کچھ نہیں ہو رہا۔ پنشن کا ڈھانچا بھی تبدیل کرنا لازم ہو چکا ہے۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Germany: The 2030 agenda is on its way".
("The Globalist". December 30, 2024)

بقیہ: شام: بشارکی معزولی، نئے امکانات

کے ذریعے دباؤ بڑھانے میں کامیاب رہیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ولادیمیر پوٹن کو ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کی دھمکی دینے کے معاملے میں بہت محتاط رہنا پڑے گا۔

تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں اپنے مفادات کا تحفظ یقینی بنانے کے لیے لازم ہے کہ امریکا، برطانیہ اور فرانس مل کر کچھ ایسا کریں جو عالمی اداروں پر اُن کے کنٹرول کو برقرار رکھنے میں مدد دے۔ چین، روس، ایران اور شمالی کوریا کا اتحاد امریکا کو اس بات کی تحریک دے رہا ہے کہ وہ فرانس اور برطانیہ کے ساتھ مل کر دنیا کو اپنی مٹھی میں لینے کی کوشش کرے۔

اگر امریکا کو مشرقِ وسطیٰ اور دیگر خطوں میں اپنے مفادات کو تقویت بہم پہنچانی ہے تو لازم ہے کہ جرمن قیادت کی مدد کرے، اُس کی معاشی مشکلات دور کرنے پر متوجہ ہو۔ جرمن معیشت اور سیاست کی مضبوطی سے امریکا اور اُس کے اتحادیوں کے لیے معاملات بہتر ہوتے جائیں گے۔ وسطی یورپ کو خرابیوں سے پاک رکھنے کے لیے جرمنی کو مضبوط رکھنا لازم ہے۔ مضبوط جرمنی خود برطانیہ اور فرانس کے بھی مفاد میں ہے۔ خود امریکا کے لیے بھی جرمنی کم اہم نہیں۔ اپنی بھرپور تکنیکی مہارت سے جرمنی باقی یورپ کے ساتھ ساتھ امریکا کے لیے بھی غیر معمولی کردار ادا کر سکتا ہے۔ جرمنی کا باقی یورپ اور امریکا سے ہم آہنگ رہنا لازم ہے۔

یورپی یونین کا اعتماد مجروح ہو چکا ہے۔ اِسے بحال کرنا بھی امریکا کے لیے محض دردِ سر نہیں بلکہ لازمی ضرورت ہے۔ مضبوط یورپ ہی کی مدد سے امریکا عالمی برادری میں اپنی ساکھ برقرار رکھ سکتا ہے۔ شام میں جو کچھ ہوا ہے، وہ دمشق، ریاض، انقرہ، تہران اور ماسکو سے ہوتے ہوئے برلن تک غیر معمولی مضمرات کا حامل ہے۔ بہت سے ملکوں کے لیے یہ ایک بڑی ڈیل ہے۔ دیکھتے رہیے کہ ہوتا کیا ہے۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"After Assad: The Hopeful Global Scenario".
("The Globalist". December 10, 2024)

۲۰۲۵ء: پاکستان کے لیے اُمیدیں اور چیلنج

ملیحہ لودھی

فروری ۲۰۲۴ء میں 'متنازع انتخابات' کے بعد پہلی بار حکومت اور حزب اختلاف کے درمیان مذاکرات کا آغاز نئے سال کا آغاز ایک امید کے ساتھ ہونے جا رہا ہے۔ جانے والے سال میں دونوں فریقوں کے درمیان شدید محاذ آرائی ہوئی اور پاکستان تحریک انصاف نے جیل میں قید اپنے رہنما عمران خان کی رہائی اور دیگر مطالبات کے لیے کئی مرتبہ سڑکوں پر اتری۔

نومبر میں ہونے والے آخری احتجاج میں دارالحکومت عملی طور پر محاصرے میں تھا، جس کے نتیجے میں قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں اور اپوزیشن کارکنوں دونوں کو جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ اب جو مذاکرات شروع ہوئے ہیں وہ ابتدائی مرحلے میں ہیں اور انہیں وزیراعظم شہباز شریف اور یقیناً عمران خان کی بھی توثیق حاصل ہے۔ ان مذاکرات کا دور پارلیمنٹ میں ہوا، جس کی صدارت اسپیکر قومی اسمبلی نے کی، تاہم یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ دونوں فریق اس بات چیت میں کتنے سنجیدہ ہیں اور کیا ان کے درمیان گہرے عدم اعتماد کو دیکھتے ہوئے یہ مذاکرات نتیجہ خیز ہوں گے، اندازہ لگانا مشکل ہے۔

ابتدائی طور پر دونوں فریق ایک دوسرے کی سنجیدگی کا جائزہ لیں گے۔ لیکن فی الحال بظاہر ایسا لگتا ہے کہ مذاکرات نے ملک کے سیاسی درجہ حرارت کو کم کر دیا ہے اور اپوزیشن کی جانب سے سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کی دھمکی پر عمل درآمد کو روک دیا گیا ہے۔ ۲۰۲۴ء میں حکومت اور اپوزیشن کے شدید تصادم کے دوران حکمران اتحاد دباؤ میں رہا جب کہ پی ٹی آئی اپنے مظاہروں کے ذریعے مطلوبہ اہداف حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ درحقیقت پچھلے کئی مہینوں میں نہ تو حکومت اور نہ ہی اپوزیشن نے اس محاذ آرائی میں کوئی فیصلہ کن بالادستی حاصل کی۔ اس تعطل نے دونوں فریقوں کو مذاکرات کی میز پر بیٹھنے پر مجبور کیا ہے۔ اگر سیاسی استحکام حاصل ہو جائے تو یہ اس معیشت کو سنبھالنے کی کوششوں پر مثبت اثر ڈالے گا، جو ابھی تک مسائل سے باہر نہیں نکلی۔ یہ سچ ہے کہ آئی ایم ایف کے بیل آؤٹ نے ملک کے دیوالیہ ہونے کے خطرے کو ٹالنے میں مدد کی ہے اور ایک مستحکم عنصر کے طور پر کام کیا ہے۔

حکومت نے ستمبر میں آئی ایم ایف سے سات ارب ڈالر کا قرضہ حاصل کیا جس کے لیے مالیاتی نظم وضبط، سبسڈیز کی حد بندی اور ٹیکس اور کفایت شعاری کے اقدامات جیسے کئی شرائط پوری کرنا پڑیں لیکن اصل چیلنج آگے ہے یعنی سخت اقدامات کو نافذ کرنا اور استحکام سے اقتصادی ترقی اور سرمایہ کاری حاصل کرنا۔ اس کے لیے سیاسی انتشار اور غیر یقینی صورتحال کے خاتمے کی ضرورت ہے جس نے پہلے ہی معیشت کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ اس لیے سرمایہ کاری کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنے کے لیے سیاسی تناؤ میں کمی ضروری ہے۔ صرف استحکام ہی سرمایہ کاروں کو راغب کر سکتا ہے۔ اگر حکومت اور اپوزیشن کے درمیان ان مذاکرات میں معاشی اصلاحات پر بھی اتفاق پیدا ہو جائے، جو ابھی تک ایجنڈے میں شامل نہیں ہے، تو یہ مارکیٹ اور سرمایہ کاروں کے لیے ایک بہت ہی مثبت پیغام بھیجے گا۔

اس کے علاوہ اور بھی چیلنجز ہیں جن کا ۲۰۲۵ء میں مقابلہ کرنا ہے جن کا حل نکالنے میں سیاسی استحکام کی فضا سے مدد ملے گی۔ ان میں خیبر پختونخوا اور بلوچستان میں دہشت گردی کے بڑھتے ہوئے واقعات شامل ہیں۔ ۲۰۲۴ء میں عسکریت پسندوں کے حملوں میں اضافے سے ان صوبوں میں کم از کم ایک ہزار شہری اور قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں کی جانیں گئیں۔ کالعدم بلوچ لبریشن آرمی کو دہشت گرد گروپ تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) کی طرح ایک بڑا سکیورٹی خطرہ سمجھا جانے لگا ہے۔

دریں اثنا کرم ضلع میں تشدد نے نومبر میں ۲۰۰ کے قریب جانیں لے لیں۔ حکومت کی ثالثی میں ہونے والے سخت امن معاہدوں کے باوجود وہاں فرقہ وارانہ کشیدگی ابھی تک حل نہیں ہوئی۔ ان سکیورٹی خطرات سے نمٹنے کے لیے وفاقی حکومت اور خیبر پختونخوا کی صوبائی حکومت کے درمیان فعال تعاون کی ضرورت ہے کیوں کہ صوبے کو بڑھتی ہوئی عسکریت پسندانہ سرگرمیوں اور فرقہ وارانہ تنازعات کا سامنا ہے۔ وفاقی نظام ان چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے مرکز اور صوبوں کے درمیان تعاون پر مبنی تعلقات کی ضمانت دیتا ہے۔

مذاکرات میں پیش رفت کے لیے دونوں فریقوں کو لچک اور ایک دوسرے کو جگہ دینی ہوگی۔ فوجی اسٹیبلشمنٹ، جو سیاسی کھیل میں شامل رہی ہے، کو بھی مذاکرات کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ فوج کا مثبت کردار غیر جانبدار ثالث کے طور پر ہونا چاہیے، بجائے اس کے کہ وہ اپنے موجودہ مؤقف پر قائم رہے، جو بڑے پیمانے پر جانبدار سمجھا جا رہا ہے۔

حکومت کو اپنے جابرانہ اقدامات ختم کرنے ہوں گے اور اپوزیشن رہنماؤں کے خلاف غیر سنجیدہ مقدمات واپس لینے ہوں گے، قابلِ ضمانت 'جرائم' میں قید افراد کو رہا کرنا ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ پی ٹی آئی کے سینکڑوں زیر حراست کارکنوں کو بھی جیلوں سے نکالنا ہوگا۔ دوسری جانب پی ٹی آئی کو اپنی اشتعال انگیز احتجاجی سیاست کو معطل کرنا ہوگا اور پارلیمنٹ کے اندر اور باہر خلل ڈالنے والے طرز عمل سے گریز کرنا ہوگا۔

اسے اپنی لڑائی سڑکوں پر لڑنے کی بجائے پارلیمنٹ میں لڑنے کا عزم کرنا چاہیے۔ خیبر پختونخوا میں پی ٹی آئی کے وزیراعلیٰ کو احتجاجی ریلیوں کی قیادت کرنے کے بجائے اپنے صوبے میں اچھی حکمرانی پر توجہ دینی چاہیے۔ یہ مذاکرات ممکنہ طور پر عدم تسلسل کا شکار رہیں گے کیوں کہ فریقین کے درمیان عدم اعتماد ہے اور پی ٹی آئی کے مذاکرات کاروں کو مسلسل جیل میں قید اپنے رہنما سے ہدایات لینا پڑیں گی۔

سیاسی مفاہمت، جس کی ملک کو اشد ضرورت ہے، شاید اب بھی دور کی بات ہو لیکن اگر دونوں فریق کسی متفقہ طرز عمل پر رضامند ہو جائیں تو یہ ملک میں وہ داخلی امن لانے میں مدد دے گا جس کی طویل عرصے سے کمی محسوس کی جا رہی ہے۔

(بحوالہ: ''انڈی پنڈنٹ اردو ڈاٹ کام''۔ ۲۶ دسمبر ۲۰۲۴ء)

بقیہ: سالِ نو: دنیا کو لاحق خدشات

ایکشن سربراہی اجلاس کی جانب اشارہ کیا ہے جس میں حکومتی نمائندگان، ٹیک کمپنیز، سائنسدان اور ماہرین شرکت کریں گے اور اے آئی کو 'عوام کے مفاد' کے مطابق لانے کے لیے بات چیت کریں گے۔ ٹیکنالوجی اور مصنوعی ذہانت کی ترقی نے مشکل سوالات اٹھائے ہیں کہ اس ترقی کے متاثر کن اثرات اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی کمزوریوں سے کیسے نمٹا جائے۔ جہاں ایک ڈیجیٹل دنیا چیلنجز لاتی ہے وہیں یہ معاشی اور سماجی شعبہ جات میں ترقی کے نئے مواقع بھی پیش کرتی ہے۔

آنے والا سال اپنے ساتھ جغرافیائی تناؤ اور معاشی چیلنجز لے کر آئے گا جو کہ نہ صرف اقوام کے لیے کڑا امتحان ثابت ہوں گے بلکہ یہ بھی بتائیں گے کہ بین الاقوامی برادری مشترکہ مسائل کو حل کرنے کے لیے مل کر کیسے کام کرتے ہیں۔

"A volatile world in 2025".
(Daily "Dawn" Karachi. December 30, 2024)

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950